ماہنامہ بتول مئی 2020

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما
انوارِ ربانی	ابتلا و آزمائش قرآن کی نظر میں	ڈاکٹر میمونہ حمزہ
قولِ نبیؐ	اپنی اولاد کو آگ سے بچایئے	سلمیٰ وہاب
گوشۂ سیرت	رسولؐ اللہ کے حکیمانہ اقدامات	محمد صفدر بشیر
خاص مضمون	قدرت کی تنبیہہ	پروفیسر خواجہ مسعود
نوائے شوق	دم وداع	بنتِ مجتبیٰ مینا
	غزل	نجمہ یاسمین یوسف
	غزل	حبیب الرحمٰن
حقیقت وافسانہ	پانچویں بیٹی	صبیحہ نبوت
	خوف کی سیڑھی پر آخری قدم	قانتہ رابعہ
	چہل قدمی	ام ایمان
	ہوشیار	فرحی نعیم
	فصل گل کی نمو	مدیحۃ الرحمان
سیر و سیاحت	ماضی کے دریچوں سے	آمنہ راحت
پل صراط پر	تتلیوں کے رنگ	فرزانہ کوثر
محشرِ خیال	ڈاکٹر میمونہ حمزہ، حبیب الرحمٰن، روبینہ اعجاز، مریم وزیر	
گوشۂ تسنیم	پہچان	بشریٰ تسنیم

بتول لاہور

انوارِ ربانی

ڈاکٹر میمونہ حمزہ

ابتلا و آزمائش

قرآن کی نظر میں مفہوم، مقصد اور علاج

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے، اس نے اپنے بندوں کے لیے اسی دین کو پسند فرمایا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دین پر چلنا پھولوں کی سیج نہیں ہے کہ آمنّا کہا اور ذمہ داری ادا کر دی۔ اس آمنّا کا قدرتی تقاضا ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے، اسے قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس راہ پر جو بھی چلا اسے آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاءؑ جب بھی دنیا میں آئے، انہیں اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی اور سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انہوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلے میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جدوجہد کی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات، اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دو، جو ان حالات میں صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ''ہم اللہ ہی کے ہیں، اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے''۔ (البقرہ، ۱۵۵۔۱۵۶)

تربیت کے لیے انسان کو مصائب کی بھٹی سے گزارا جاتا ہے۔ خوف و خطر میں مبتلا کر کے، جان و مال کا نقصان دے کر، مصائب اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے، اللہ تعالیٰ طالبِ صادق کے عزم و صمیم کا امتحان کرتے ہیں۔ یہ آزمائشیں اس لیے ضروری ہیں کہ مؤمنین اسلامی نظریہِ حیات کی ذمہ داریاں اچھی طرح سے پوری کرنے کے قابل ہو سکیں اور اسلامی نظریہ حیات کی راہ میں جتنا مصائب سے دوچار ہوں اسی قدر نظریہ حیات انہیں عزیز ہوتا جائے۔ (فی ظلال القرآن، البقرۃ، ۱۵۵)

آزمائش ناگزیر ہے

مومن پر آزمائش اتارنا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، اور اس کی اتنی بڑی حکمت ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کو ابتلاء کا سامنا نہ ہوا ہو۔ اللہ کا ارشاد ہے:

''ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔'' (الانبیاء، ۳۵)

یعنی راحت اور رنج، مفلسی اور امیری، غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف، صحت اور بیماری، غرض تمام مختلف حالات میں تم سب لوگوں کی آزمائش کی جا رہی ہے تا کہ دیکھیں تم اچھے حالات میں متکبر، ظالم، خدا فراموش، بندہِ نفس تو نہیں بن جاتے، اور برے حالات میں کم ہمّتی کے ساتھ پست طریقے اور ناجائز راستے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ لہٰذا کسی صاحبِ عقل آدمی کو ان مختلف حالات کو سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ جو حالت بھی اسے پیش آئے اس کے امتحانی اور آزمائشی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے اور اس سے بخیریت گزرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صرف ایک احمق اور کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ جب اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے اور جب برے حالات پیش آجائیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے۔ (تفہیم القرآن، ج۳، ص۱۵۸۔۱۵۹)

ایمان لانے کے بعد مصائب کا آنا ناگزیر ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''مسلمانو! تمہیں جان اور مال دونوں کی آزمائشیں آ کر رہیں گی اور تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ (آل عمران، ۱۸۶)

یعنی ان کے طعن وتشنیع، ان کے الزامات، ان کے بے ہودہ طرزِ کلام اور ان کی جھوٹی نشر واشاعت کے مقابلے میں بے صبر ہو کر تم ایسی باتوں پر نہ اتر آؤ جو صداقت وانصاف، وقار وتہذیب اور اخلاقِ فاضلہ کے خلاف ہوں''۔(تفہیم القرآن، ج۱،ص۳۰۹)

آزمائش کو ہر دعوت کی سنت اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے داعی اور دعوت دونوں مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مقابلہ ہی انسان کی خفیہ قوتوں کو بیدار کرتا ہے، ان کو نشوونما دیتا ہے، اور پھر انہیں ایک راہ پر لگاتا ہے۔

ہاں، یہ درست ہے کہ فتنہ وابتلا کے انداز ہر دور میں بدل جاتے ہیں اور پروپیگنڈے کے نئے نئے وسائل سامنے آ جاتے ہیں۔ ایذا دینے کے طریقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں شہرت کو خراب کیا جاتا ہے تو کہیں تصورات کے بنیادی عناصر کو خراب کیا جاتا ہے اور دعوت کے مقاصد کے بارے میں غلط تاثرات دیے جاتے ہیں۔(دیکھئے: فی ظلال القرآن، ج۱،ص۴۹۷)

انسان اور آزمائش

انسان کی پیدائش اور دنیا میں اس کی زیست کا مقصد ہی امتحان تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے''۔(الملک،۲)

یعنی زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے، اور موت کے معنی امتحان کا وقت ختم ہو گیا ہے۔ جب انسان کے دل میں یہ عقیدہ بیٹھ جائے تو وہ بیدار، چوکنا اور سمجھدار ہو جاتا ہے، اور وہ پوری کائنات کو اپنے لیے دارالامتحان ہی سمجھتا ہے، جس میں اس کے لیے کسی بھی گوشے سے ابتلا کا دروازہ کھل سکتا ہے، اور اس ابتلا میں اس کا رویہ ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ کامیاب ٹھہرا یا ناکام!

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جنہیں پسند کرتا ہے انہیں بھی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، تاکہ وہ اطاعت پر مضبوطی سے قائل رہیں، اور اس مصیبت میں صبر کریں۔ اور یہ مصیبت ان کے لیے اجر میں اضافے کا ذریعہ بنتی ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ''ہم ایمان لائے'' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون''۔(العنکبوت،۲۔۳)

تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے، اسے آزمائش کی بھٹی میں ڈال کر ضرور تپایا گیا ہے۔ یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ اہلِ ایمان کی آزمائش کرتا ہے، اور اسی بنا پر کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والی نعمتیں بھی آزمائش ہیں:

''اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامانِ آزمائش ہیں، اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے''۔(الانفال،۲۸)

اللہ تعالیٰ دو محبوب عطیات کے ذریعے بندوں کی دنیا کی زندگی میں آزمائش کرتا ہے، جو دنیا کی زندگی کی زینت ہیں۔ یعنی فتنہ محض مشکلات اور محرومی کی شکل ہی میں نہیں آتا بلکہ یہ خوش حالی اور عطیات کی شکل میں بھی آتا ہے۔ یہ امتحاں اسی لیے ہے کہ بندہ مال اور اولاد کے مقابلے میں اللہ سے ملنے والے اجر کو قیمتی سمجھے، اور ان کی محبت میں گرفتار ہو کر راستی سے نہ ہٹے۔ مال اور اولاد دنیا کی زندگی میں ملنے والے دو پرچے ہیں، یہ بندے کے حوالے اسی لیے کئے گئے ہیں کہ ان کے ذریعے جانچ کر دیکھا جائے کہ وہ حدود اور حقوق کا کتنا لحاظ کرتا ہے۔ وہ اللہ کی فرمانبرداری کو اولیت دیتا ہے یا انہیں محبتوں کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''اور ہم ان کو اچھے اور برے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ آئیں''۔(الاعراف،۱۶۸)

اللہ تعالیٰ نافرمانوں پر مصیبتیں بھیج کر انہیں ابتلا میں ڈالتا ہے

تا کہ وہ سرکشی سے باز آجائیں۔قرآن کریم میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

''آخر کار ہم نے ان پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل چھوڑے، سرسریاں پھیلائیں، مینڈک نکالے، اور خون برسایا، یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں، مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے، اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے''۔(الاعراف،۱۳۳)

یعنی وہ نشانیاں واضح طور پر بتا رہی تھیں کہ ایک کے بعد ایک ابتلا آرہی ہے اور بعد میں آنے والی پہلی کا منطقی نتیجہ تھی، اور ہر ابتلا کو دیکھ کر وہ پیغمبر سے وعدہ کرتے کہ اگر ان سے یہ مصیبت ٹال دی جائے تو وہ ان کی بات مان لیں گے، لیکن جب بھی عذاب ٹلتا تو ان کی روش وہی رہتی۔

اصحابِ سبت کی آزمائش کا سبب بھی ان میں سے فاسقوں کو چھانٹ کر الگ کرنا تھا، اسی لیے فرمایا:

''اور ذرا ان سے اس بستی کا حال بھی پوچھو جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ جب وہ سبت کے دن احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتے تھے، اور یہ کہ مچھلیاں سبت ہی کے دن ابھر ابھر کر سطح پر ان کے سامنے آتی تھیں اور سبت کے سوا باقی دنوں میں نہیں آتی تھیں۔ یہ اس لیے ہوتا تھا کہ ہم ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈال رہے تھے''۔(الاعراف،۱۶۳)

بندوں کی آزمائش کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص یا گروہ میں فرمانبرداری سے انحراف اور نافرمانی کی جانب میلان دیکھتا ہے تو اس کے سامنے نافرمانی کا دروازہ کھول دیتا ہے تا کہ اس کے چھپے ہوئے میلانات کھل کر نمایاں ہو جائیں، اور وہ اس سے صرف اس بنا پر باز نہ رہ جائے کہ اس کو ان کے ارتکاب کا موقع نہ مل سکا۔

آزمائش۔اللہ کی سنت

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے، اور یہ اللہ کی ایسی سنت ہے جو دنیا میں ہر آن جاری ہے، ارضی خلیفہ کو مقرر کرتے ہوئے ابلیس ایسی ہی آزمائش میں تکبر کے ہاتھوں ذلیل ہوا، اور آدمؑ اور ان کی بیوی خطا کا ارتکاب کر کے پھر اس کی رحمت کے سائے میں آگئے۔ زمین پر اتارے گئے تو ابلیس لعین اپنے لشکر کے ساتھ موجود تھا، جس کا وار آدمؑ کے ایک بیٹے پر چل گیا۔ دونوں بھائیوں نے اللہ کے حضور قربانی پیش کی، ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ اور وہ اپنے قصور کی اصلاح کرنے کے بجائے نفس کے تکبر کا شکار ہوا، اور بھائی کے قتل کا ارتکاب کر کے خود کو امتحان میں ناکام ثابت کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت نوحؑ کو بیٹے اور بیوی کے کفر سے آزمایا، اور ان کا بیٹا ان کی آنکھوں کے سامنے طوفان میں غرق ہوا۔ اور جب انہوں نے بشری کمزوری سے مغلوب ہو کر اللہ کے حضور درخواست کی کہ ''انّ ابنی من اھلک'' میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے، اور تیرا وعدہ سچا ہے تو اللہ نے کہہ دیا کہ: ''انّہ لیس من اھلك'' وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر، جس کی حقیقت تو نہیں جانتا''۔(دیکھیے :ھود،۴۵،۴۶)

حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سخت آزمائشوں میں مبتلا کیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''یاد کرو جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا''۔(البقرۃ،۱۲۴)

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ان آزمائشوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ دنیا میں جتنی چیزیں ایسی ہیں، جن سے انسان محبت کرتا ہے، ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے حق کی خاطر قربان نہ کیا ہو۔ اور دنیا میں جتنے خطرات ایسے ہیں، جن سے آدمی ڈرتا ہے، ان میں سے کوئی خطرہ ایسا نہ تھا جسے انہوں نے حق کی راہ میں نہ جھیلا ہو۔(تفہیم القرآن، ج۱،ص۱۱۰)

ابراہیمؑ کی ابتلا تارے، چاند اور سورج سے ہوئی تو انہوں نے

ربّ توحید کو پالیا اور اس کا علی الاعلان اقرار کرلیا۔ آگ میں پھینکے گئے تو صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا، انہیں گھر بار چھوڑ دینا پڑا تو بخوشی ہجرت اختیار کرلی۔ ایک طویل عرصے تک بے اولادی سے آزمایا تو اس پر پورے اترے، اور بیٹا ملا تو اسے قربان کردینے کا اشارہ ہوا اور باپ بیٹا دونوں خوشی خوشی اس پر تیار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے فرمایا: ''اور ابراہیمؑ جس نے وفا کا حق ادا کردیا''۔ (النجم، ۳۷)

رسول کریم ﷺ یتیمی اور فقر سے بچپن میں آزمائے گئے، پھر کفارِ مکہ اور قریبی رشتوں میں بھی مخالفت، شعبِ ابی طالب میں محاصرہ اور قاتلوں کے محاصرے سے نکل کر ہجرت کا پرخطر اور مشکل سفر، اور مدینہ منورہ کی سرزمین پر آئے دن یہود و منافقین کی سازشوں کا مقابلہ اور کبھی مشرکین سے دو بدو جنگ! آپؐ نے ہر آزمائش کو صبر سے برداشت کیا، اللہ تعالیٰ نے نعمتیں بھی بہت عطا کیں، آپؐ کے ذکر کو بلند کردیا اور کوثر عطا فرمائی۔

اللہ تعالیٰ مختلف قوموں کی آزمائش کرتا ہے، ایک عمومی امتحان کے علاوہ کسی کی خاص آزمائش بھی ہوتی ہے، جیسے قومِ ثمود کے لیے اونٹنی کو آزمائش بنایا:

''ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔ اب ذرا صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے۔ ان کو جتادے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پر آئے گا۔ آخر کار ان لوگوں نے اپنے آدمی کو پکارا۔ اس نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور اونٹنی کو مار ڈالا''۔ (القمر، ۲۷)

سینوں کے رازوں کی آزمائش

اللہ تعالیٰ کھوٹے اور کھرے کو آزمائش کے ذریعے چھانٹ لیتا ہے۔ یہ آزمائش زندگی کے ہر معاملے میں ہوتی رہتی ہے اور مشکلات میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جنگ کے میدان میں بھی بندوں کی ایسی آزمائش کرتا ہے۔ احد کی شکست پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

''اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے''۔ (آل عمران، ۱۵۴)

اس سے بڑی آزمائش اور کوئی نہیں کہ دلوں کی بات کو ظاہر کردیا جائے، اور جو دلوں کی تہہ میں ہے وہ اوپر آجائے۔ اس سے کھوٹ اور ریاکاری کو علیحدہ کردیا جائے، اور بغیر کسی ملمع کاری اور بغیر کسی پردے کے حقیقت سامنے آجائے۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہے ان باتوں کے لیے جو دل کے خزانے میں پوشیدہ رکھی ہوتی ہیں، سامنے آجاتی ہیں۔ یہ ہے تطہیر القلوب اور تصفیہ القلوب، اس طرح کہ اس میں کوئی ملاوٹ اور کھوٹ نہ رہے اور سب کچھ صاف صورت میں سامنے آجائے''۔ (فی ظلال القرآن، تفسیر الآیہ)

اہلِ ایمان کی آزمائش

اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی کئی طرح آزمائش کرتے ہیں۔ کبھی ان کو کسی چیز سے محروم کردیا جاتا ہے اور کبھی کوئی محبوب شے چھن جاتی ہے۔ کبھی مال کا نقصان پہنچتا ہے اور کبھی آسائشِ دنیا کے دروازے ان پر بند ہو جاتے ہیں۔ کبھی کثرتِ عیال اور محدود وسائل سے آزمائے جاتے ہیں اور زندگی کی گاڑی کھینچتے ہوئے جان جوکھوں میں ڈالتے ہیں۔ کبھی قرضوں کا بوجھ ہے تو کبھی کھیتی جل جاتی ہے، کبھی خود کو یا کسی پیارے کو مرض کا مقابلہ کرتے پاتے ہیں تو کبھی موت کے تلخ گھونٹ پیتے ہوئے۔ کبھی اپنوں کی بے وفائی کے زخم سہتے ہیں تو کبھی حاسدوں کے حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے زندگی جہدِ مسلسل ہی نہیں، بلکہ ''رکاوٹوں کی دوڑ'' بھی ہے۔ کبھی کندھوں پر گناہوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے اور کبھی قوم کے اراذل اس پر حکمران بن جاتے ہیں۔ کبھی بیرونی حملہ آور مسلط ہوتے ہیں اور کبھی اندرونی اشرار ناک میں دم کردیتے ہیں۔ کہیں دیکھے دشمن ہیں اور کہیں ان دیکھے، کہیں وبائیں ہیں اور کہیں زمانی آفتیں۔

ایسی ہی آزمائشوں سے اہلِ ایمان چھانٹ کر الگ کرلیے جاتے ہیں، اور منافقین الگ۔ اور آزمائشیں پیہم آتی ہی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''کیا یہ لوگ (منافقین) دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک دو مرتبہ یہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں؟ مگر اس پر بھی نہ تو بہ کرتے ہیں نہ کوئی سبق لیتے ہیں''۔(التوبہ،۱۲۶)

یعنی کوئی سال ایسا نہیں گزر رہا ہے جب کہ ایک دو مرتبہ ایسے حالات نہ پیش آجاتے ہوں جن میں ان کا دعوائے ایمان آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا جاتا ہو اور اس کا کھوٹ فاش نہ ہو جاتا ہو۔(تفہیم القرآن، ج۲، ص۲۵۳)

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر ابتلا کے دور کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

''وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی، جو تمہیں سخت عذاب میں مبتلا رکھتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی''۔(الاعراف،۱۴۱)

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر ہونے والے مظالم کی تصویر کشی کرتے ہیں، جب فرعونیوں نے انہیں مسلسل عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، گویا یہ ایک عظیم ابتلا تھی۔اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر کے اجر کو محفوظ رکھا اور انہیں فرعونیوں سے نجات عطا کی (اگر چہ بعد میں بنی اسرائیل ناشکری ہی کرتے رہے)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسانوں میں سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاءؑ کو آتی ہیں، اس کے بعد صالحین کو، اس کے بعد ان کو، جو ان سے زیادہ مشابہت رکھنے والے ہوتے ہیں''۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وہی ہے جس نے تمہیں زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس پر تمہاری آزمائش کرے''۔(الانعام،۱۶۵)

دنیا کی زندگی دراصل امتحان گاہ ہے۔اس میں ملنے والی نعمتیں، وسائل، قابلیتیں ایک امانت کی مانند ہیں کہ ان میں کیسا تصرف کیا۔

بندوں پر آزمائش آنے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں:

۱۔گناہوں کی کثرت اور بندے کا ان کو ہلکا سمجھنا۔

۲۔اعلانیہ اللہ کی معصیت میں مبتلا ہونا اور فحش کاموں کا ارتکاب کرنا۔

۳۔بندوں پر ظلم کرنا اور ان کے حقوق سلب کر لینا۔

۴۔مسلمان بھائی کو عار دلانا، اسے حقیر سمجھنا اور اسے گالی دینا۔

۵۔والدین کی نافرمانی اور قطع رحمی۔

۶۔ظالموں کا ساتھ دینا اور اہل الفساد کی مدد کرنا۔

۷۔حرام کھانا اور محرمات کو حلال کر لینا۔

۸۔غرورِ نفس یا متکبرانہ خیالات کا چھو جانا۔

مومن کو اس کی تقصیر پر جلد پکڑ لینا بھی اللہ کی جانب سے اس کا بھلا ہی ہوتا ہے کہ وہ گناہوں کی کثرت سے باز رہتا ہے۔حدیث میں ہے:

''جب اللہ اپنے بندے سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ دنیا میں اسے جلد سزا دے دیتا ہے۔اور جب اپنے بندے سے شر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہ کو پکڑ کر رکھتا ہے تاکہ اسے قیامت کے دن پورا پورا بدلہ دے''۔(مسند احمد) اور یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کی آزمائش، آخرت کی بلا سے ہلکی ہے۔

اور مومن پر جب اللہ کی طرف سے آزمائش آجائے تو اسے کثرت سے توبہ کرنی چاہیے، وہ استغفار کرے، اس گناہ سے رک جائے اور آئندہ کے لیے اپنے طرزِ عمل کو درست کر لے۔

اور کبھی اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے تاکہ اپنے بندوں کے ایمان اور راہِ حق میں استقامت کو جانچ لے۔پھر جب ظالم اللہ کی پکڑ سے بالکل غافل ہو جاتا ہے تو وہ اسے اچانک پکڑ لیتا ہے اور اس وقت واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہوتے ہیں۔اس وقت اپنے آپ کو ''رب الاعلیٰ'' کہنے والا فرعون بھی بے بسی سے پکارتا ہے ''میں بنی اسرائیل کے رب پر ایمان لاتا ہوں''۔

جب بندے پر اللہ کی جانب سے آزمائش آئے اور وہ صبر کے ساتھ اللہ کی بندگی پر قائم رہے اور اسی سے اجر کا امید وار ہو، اور اللہ کے وعدے کا یقین رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت کرتا ہے جیسا کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''بڑی آزمائش کا اجر بھی بڑا ہوتا ہے، اور اللہ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، جو اس پر راضی رہے وہ اس سے خوش ہو جاتا ہے، اور جو اس پر شکوہ کرے، وہ بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے''۔ (رواہ ترمذی)

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ انسان پر آزمائشوں کا آنا قدرتی ہے، اس کا بندوں کے اعمال، ظلم کے ارتکاب اور گناہوں سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا کوئی شرعی سبب نہیں ہوتا، تو یہ کتاب وسنت میں وارد حقائق کے برعکس ایک غلط اور خلافِ شرع سوچ ہے۔

جس انسان کو دنیا میں نعمتوں کی کثرت ملے، اور وہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتا رہے، اسے اللہ کی نافرمانیوں کے باوجود وافر رزق میسر ہو تو یہ واضح دلیل ہے کہ وہ اللہ سے بہت دور ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی رسی دراز کئے دے رہا ہے، تاکہ وہ اپنی گمراہیوں میں اور بھٹکتا رہے۔ وہ جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ اس کی نعمتوں کو اور بڑھا دیتا ہے تاکہ وہ گناہوں کی دلدل میں اور زیادہ پھنستا چلا جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

''ہم ایسے طریقے سے ان کو بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی۔ میں ان کی رسی دراز کر رہا ہوں، میری چال بڑی زبردست ہے''۔ (القلم، ۴۵۔۴۴)

''ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں''۔ (محمد، ۳۱)

آزمائش ہر ایک کی ہے، اور یہ جانچ کافرانہ اور مومنانہ رویے کی ہے کہ ایسے وقت میں انسان کا کون سا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ اور اللہ کسی کو اس کی بساط سے زیادہ کا مکلّف نہیں ٹھہراتا۔ مومن کو ہر حال میں اپنے اعمال پر نظر رکھنی چاہئے۔ قصور ہو جانے پر توبہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے، بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ کی جانب رجوع کرنا چاہیے اور فتنے میں پڑنے سے بچنا چاہیے۔

آزمائش میں اللہ کی جانب رجوع ہی سب سے عمدہ عمل ہے۔ اسی سے نجات کی امید بندھتی ہے۔ حضرت یونسؑ نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ کو پکارا: ''لا الہ الا انت سبحنك انی کنت من الظالمین''۔ (الانبیاء، ۸۷)

☆☆☆

سلمیٰ وہاب

اپنی اولاد کو آگ سے بچایئے!

قرآن مجید میں فرمان الٰہی ہے:

قوا انفسکم و اھلیکم نارا

''بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو (جہنم کی) آگ سے''۔(الحریم۔66)

گھر والوں میں اولاد اہم ترین حصہ ہے۔ بچے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام بھی ہیں اور امانت بھی۔لہٰذا جہاں ہمیں اللہ تعالیٰ کی اس عطا میں خوش اور شکر گزار رہنا چاہیے وہیں ان کی بہترین تربیت کے لیے فکرمند اور کوشاں بھی رہنا چاہیے۔ یہ صد شکر کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین اور دنیا کا جانشین چھوڑنے کے لیے چن لیا۔

اس اولاد کی تربیت میں اور اسے جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے جو امور اہم ہیں ہم ان کا تذکرہ یہاں کریں گے۔

مقصد زندگی کا شعور

اولاد کی تربیت میں سب سے پہلے مقصد زندگی کو رکھیں۔ بچے کو صحیح سمت میں رہنمائی جاری رکھیں۔ان کو زندگی کا مقصد سے آگاہی وقتاً فوقتاً دیتے رہیں۔ وہ دنیا میں کیوں آئے ہیں اور یہ کہ انہیں ایک دن اس دنیا سے رخصت بھی ہونا ہے درست طرز عمل کیوں اختیار کرنا ہے اور غلط طرز عمل سے کیوں رکنا ہے اس کا شعور اجاگر ہونا ضروری ہے۔ساتھ ہی ساتھ جنت کو پانے کا شوق اور دوزخ سے بچنے کی فکر پیدا کرنی چاہیے۔

اگر بچہ غلط یا برا کام کرے تو مار یا ڈانٹ سے بہتر ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا احساس دلائیں۔ساتھ ہی اللہ کی رحمت اور محبت کا بھی احساس دلا دیں کہ اگر نماز میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور آپ سے راضی ہو جائیں گے۔

اللہ اور رسولؐ کی محبت

سیرت کے واقعات کو بچوں کے ساتھ روز مرہ کی گفتگو میں رکھیں۔ بچے کے اندر سیرت کے مطالعہ کا شوق بھی پیدا کرنا چاہیے اور نبیؐ کی زندگی کے حوالے سے واقعات بھی سناتے رہنا چاہیے۔ جو معاملہ درپیش ہو اس میں نبی کریمؐ کی مثالیں پیش کریں۔ جیسے بچے کو اپنا کام خود کرنے کی ترغیب دلانے کے لیے بتائیں کہ ہمارے پیارے نبیؐ اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ چھوٹے بچوں کو کھانا کھانے کے دوران ساتھ ساتھ بتاتے جائیں کہ آپؐ ایسے کھانا کھاتے تھے اور ایسے پانی پیتے تھے۔کبھی کبھی آپؐ کی زندگی کے حوالے سے دلچسپ باتیں بھی بتائی جا سکتی ہیں جیسا کہ نبی پاکؐ نے کھجوریں کھاتے ہوئے گٹھلیاں حضرت علیؓ کے سامنے رکھ دیں اور فرمایا کہ علیؓ نے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں حضرت علیؓ نے برجستہ جواب دیا کہ آپؐ تو گٹھلیوں سمیت کھا گئے۔

بچے کو گھر کی پکی چیز ہمسائے میں بھجواتے ہوئے ساتھ میں نبی کریمؐ کا حکم بھی بتا دیں۔اس طرح بچے کے دل میں نبی کریمؐ کی محبت جاگے گی اور سیرت کو جاننے کا شوق پیدا ہوگا۔

نبیؐ کا ارشاد ہے:

''باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دے اس میں سب سے بہتر عطیہ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت ہے''۔(مشکوٰۃ)

اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین قسم کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کا اجر و ثواب مرنے کے بعد بھی ملتا رہتا ہے۔

ایک یہ کہ وہ صدقہ جاریہ کر جائے۔

دوسرا یہ کہ وہ علم چھوڑ جائے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

تیسرا صالح اولاد جو باپ کے لیے دعا کرتی رہے۔(مسلم)

اس دینی تربیت کے اثرات نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بچے کو نماز کا طریقہ سکھایا جائے۔نماز پڑھنے کی ترغیب اور تلقین

کرتے رہنا چاہیے۔لڑکوں کے اندر مسجد جانے کا شوق ابھارا جائے۔

طہارت ونظافت کی تلقین

صفائی نصف ایمان ہے۔صفائی میں پاکیزگی بھی شامل ہے۔ شروع سے ہی بچوں کے اندر طہارت ونفاست اور گندگی سے بیزاری پیدا کی جائے۔استنجا کی اہمیت اور نہ کرنے کی وعید بتائی جائے۔گھر میں جمعہ کے غسل کا خاص اہتمام ہو۔جسم،لباس،بستر،کمرا گھر اور گلی پاک وصاف رکھنے کا شعور دینا اور اس کو بچپن سے ہی عادت کا حصہ بنانا ضروری ہے۔

جھوٹ سے بچنے کا شعور

بچوں کو جھوٹ سے بچنے کا شعور دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ خود بچے کے ساتھ کبھی جھوٹ نہ بولیں۔حق بات کہیں بچے کے ساتھ صبر کا معاملہ رکھیں۔

حضرت عبداللہ بن عامرؓ فرماتے ہیں:

ایک دن حضورؐ ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے۔میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا! یہاں آؤ میں تجھے ایک چیز دوں گی۔حضورؐ نے دیکھ لیا اور پوچھا:تم بچے کو کیا دینا چاہتی ہو؟ والدہ بولیں میں اسے کھجور دینا چاہتی ہوں۔آپؐ نے والدہ سے فرمایا،اگر تم دینے کا کہہ کے بلاتیں اور بچے کو آنے پر کچھ نہ دیتیں تو تمہارے اعمال نامہ میں یہ جھوٹ لکھ دیا جاتا۔(ابوداؤد)

لہٰذا بچے کے ساتھ جھوٹ یا دھوکے کا کوئی معاملہ نہ کریں خواہ وجہ کوئی بھی ہو۔

اور وہ تو بہت مشہور حدیث ہے کہ:

اس طرح ایک شخص نبیؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں بہت سی برائیوں کا شکار ہوں میں کون سی برائی سب سے پہلے ترک کردوں۔آپؐ نے فرمایا کہ تم جھوٹ بولنا ترک کردو۔وہ شخص جب بھی کسی برائی کا ارادہ کرتا تو اسے خیال آجاتا کہ اگر اللہ کے رسولؐ نے پوچھ لیا تو میں کیا جواب دوں گا کیونکہ جھوٹ تو میں نے بولنا نہیں۔اس طرح وہ شخص تمام برائیوں سے باز آگیا۔

اگر بچے سچائی کے عادی ہوں گے تو وہ بہت سی برائیوں سے بچ جائیں گے۔ماں باپ بھی پرسکون رہیں گے اور بچے کا بھی اعتماد اور عزت بڑھے گی۔

اعتماد امید اور ہمت

بچے کو کبھی مایوس نہ ہونے دیں۔ہر معاملے میں اس کی ہمت اور حوصلہ بڑھائیں۔دوسروں کے سامنے اسے شرمندہ اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں اس سے بچہ اندر سے کمزور ہو جائے گا جیسے وہ ایک ناکام بچہ ہے اور کچھ نہیں کرسکتا۔اس کی چھوٹی چھوٹی اچھائیوں کی بھی دل کھول کر حوصلہ افزائی کریں۔آپ دیکھیں گے کہ اس سے بچے کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔

نبیوں اور صحابہ کرامؓ کی بہادری کے قصے سنائیں۔بلی کتے کا خوف ہرگز نہ دلائیں۔

ہر وقت کی ڈانٹ بچے میں بداعتمادی پیدا کرتی ہے۔وہ ماں باپ سے دور رہنے لگتا ہے۔بے جا پابندیاں بھی بچے کو باغی بنا دیتی ہیں۔ ہر وقت کی روک ٹوک سے پرہیز کریں۔برتن توڑ دینے پر لعنت ملامت کرنا اور اللہ کی نافرمانی پہ خاموش رہنا بچے کے ساتھ سخت زیادتی ہے۔ نماز ترک کرنا،جھوٹ بولنا،چغلی کھانا،دوسرے بچوں کے ساتھ زیادتی ایسے معاملات ہیں جن پر سمجھانا بلکہ ڈانٹ پلانا یا کوئی سزا دینا بھی طے کیا جاسکتا ہے۔ساتھ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا احساس بھی دلائیں اور اللہ تعالیٰ کو منانے کے لیے کوئی نیکی کرنے کی ترغیب دلائیں۔بلکہ ہو سکے تو بچے سے کہیں کہ اپنے جیب خرچ سے صدقہ بھی کریں۔اس سے اصلاح کے عمل میں اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شامل حال ہوگی۔

بچے کے ساتھ کسی بھی رویے اور کوشش کو معمولی مت سمجھیے آپ کی کوئی بھی کوشش رائیگاں نہیں جائے گی،آج نہیں تو کل ضرور رنگ دکھائے گی۔

محبت فاتح عالم

بچے زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ گزارتے ہیں اس لیے زیادہ تر اپنی ماں کا پرتو ہوتے ہیں۔لہٰذا ماں جو چاہتی ہے بچے کریں،وہ ماں کو سب سے پہلے خود کرنا ہوگا۔اگر ماں گھر میں پیار محبت کا ماحول دیکھنا چاہتی ہے تو بچے کے ساتھ جارحانہ رویہ نہ رکھے۔ہر معاملے میں پیار اور

دھیما لہجہ اپنائے۔ کبھی کبھی بچے کو اپنے ساتھ لٹائے، چومے اور رات کو اپنے بازو پر سلا کے اور زبان سے محبت کا اظہار بھی کرے۔

ایک مرتبہ اقرع بن حابس نبیؐ کے پاس آئے۔ حضورؐ اس وقت حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے۔ اقرع کو دیکھ کر تعجب ہوا اور بولے یارسول اللہؐ! آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں؟ میرے تو دس بچے ہیں لیکن میں نے تو کبھی کسی ایک کو بھی پیار نہیں کیا۔ نبی پاکؐ نے اقرع کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا، اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ (آدابِ زندگی)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی اولاد آپ کی نافرمانی نہ کرے تو آپ اپنے رب کی نافرمانی ہرگز نہ کیجیے۔ جب آپ اپنے رب کے فرمانبردار ہوں گے تو آپ کے بچے آپ کے فرمانبردار ہوں گے۔

وراثت میں تقویٰ

بچوں کے لیے مال اور جائیداد جمع کرنے کی تگ ودو میں نہ لگے رہیے اور بچوں کے دل میں بھی مال کی محبت جمع نہ ہونے دیں۔ اس سے بچے کی معصومیت ختم ہو جاتی ہے اور بچپن سے ہی حسد اور لالچ پیدا ہو جاتا ہے جو نہ صرف اخلاق کو تباہ کر دیتا ہے بلکہ زندگی کی خوشیاں اور آخرت کا سکون بھی برباد کر دیتا ہے۔

بہتر ہے کہ جب تک بچہ آپ کی نگرانی میں ہے اس کے ہاتھ میں کھلا پیسہ نہ دیجیے بلکہ اس کی ہر ضرورت خود پوری کیجیے۔ نہ ہی بچے کے دل میں چیزوں کی خواہشات ابھاریے۔ اس کی بجائے بچے میں صدقہ و خیرات کا جذبہ اجاگر کرنے کے لیے اس کے ہاتھ سے غریبوں کو پیسے اور کھانا دلوایے۔

یاد رکھیے آپ بچے کے لیے جتنا بھی مال ومتاع جمع کر کے چھوڑ جائیں گے بچے کو اس کے مقدر کا ہی ملنا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کے جانے کے بعد وہی مال اس کی بربادی اور بگڑنے کا سبب بن جائے۔ ہاں آپ کی دی ہوئی اچھی تربیت اور تقویٰ آپ کے جانے کے بعد بھی آپ کے بچے کو محفوظ و مامون رکھے گا اور صراط مستقیم پر قائم رکھے گا اور آپ کو بھی اس کا اجر پہنچتا رہے گا۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کثیر الاولاد تھے۔ انہوں نے بہت بڑے خطے پر حکمرانی کی۔ کسی نے پوچھا آپ نے اولاد کے لیے کیا چھوڑا ہے تو انہوں نے جواب دیا، میں نے اولاد کے لیے تقویٰ چھوڑا ہے۔

دعا ایک سہارا

بچوں کی اچھی تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا کرم اور مدد درکار ہے۔ اس کے لیے بہت زیادہ دعائیں کیجیے۔ صلوٰۃ حاجت اور استغفار کا معمول بنا لیجیے۔ تہجد گزاری کیجیے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے مامون رہیں تو اپنے اردگرد کے غریب مسکین اور یتیم بچوں کا خیال رکھیے۔ اللہ تعالیٰ انعام میں ہمارے بچوں پر کرم فرمائیں گے انشااللہ۔

☆.....☆.....☆

محمد صفدر بشیر

رسول اللہؐ کے حکیمانہ اقدامات

رسول کریم ﷺ کے ارشادات کی حکمت و افادیت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ آج بھی ان کی اہمیت وصداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آپؐ کے چند ایک ارشادات پیش خدمت ہیں:

معاہدات امن کی اہمیت:

۱۴۰۰ سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ نے مدینہ میں مختلف قبائل کو جمع کر کے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو تاریخ میں میثاق مدینہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے نتیجہ میں خانہ جنگی تھم گئی اور مدینہ میں امن وامان کی صورت حال بہتر ہوگئی۔ جو مدینہ کی ترقی کا باعث بنی۔

آج کی مہذب دنیا بھی اس حقیقت کو سمجھ گئی ہے کہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ جنگ ہے جو ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ آج بھی جنگ کی آگ سے بچنے کے لیے اور لگی ہوئی اس آگ کو بجھانے کے لیے دنیا کے بیشتر ممالک معاہدوں پر معاہدے کر رہے ہیں اور ایسے معاہدات پر صدق دلی سے عمل پیرا ہونے کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔

تفریح گاہ کی اہمیت

رسول اللہؐ نے مدینہ سے باہر ایک سرسبز سیر گاہ بنوائی۔ اس جاہلیت اور جنگ وجدل کے دور میں ایسی سیر گاہ بنوانا ایک نئی بات تھی۔ آپؐ نے اس سیر گاہ میں پھول پودے درخت وغیرہ لگوائے اور اس سیر گاہ کا نام محی النقیع رکھا گیا۔ آپؐ گاہے بگاہے بہ نفس نفیس اس سیر گاہ میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ عام لوگوں کا رجحان بھی اس سیر گاہ کی سیر کرنے کا بڑھنے لگا یہاں تک کہ جلدی وہ ایک تفریح گاہ میں تبدیل ہوگئی اور لوگوں کی اس تفریح گاہ میں جانے کی رغبت بڑھنے لگی۔

آج چودہ سو سال بعد دنیا کو آپؐ کے اس عمل مبارک کی حکمت خوب سمجھ میں آگئی ہے کہ ذہنی تھکان دور کرنے اور ذہنی بالیدگی کے لیے ایسی تفریح گاہیں کس قدر ضروری ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں اور جدید ٹاؤن پلاننگ میں ایسی تفریح گاہوں کو شہروں اور جدید آبادیوں کا ضروری حصہ سمجھا جانے لگا ہے۔

کشادہ شاہراہیں

مدینہ منور کی گلیاں کشادہ ہوا کرتی تھیں۔ اتنی کشادہ کہ سامان سے لدے ہوئے دو اونٹ با آسانی گزر سکتے تھے۔ رسولؐ کا ارشاد تھا کہ گھروں کی وجہ سے گلیوں اور گزرگاہوں کو تنگ نہ کرو۔ آج چودہ سو سال بعد بڑے بڑے معروف ٹاؤن پلانرز نقشہ جات میں گلیوں اور شاہراہوں کی مناسب چوڑائی کو ضرور ملحوظ رکھتے ہیں۔ جن ہاؤسنگ سوسائٹیوں کے نقشہ جات میں مرکزی شاہراہوں سے ملحقہ گلیاں اور لنک روڈز کشادہ دکھائے گئے ہوتے ہیں ان سوسائٹیوں میں پلاٹ حاصل کرنے کو لوگ ترجیح دیتے ہیں۔

مرکزی سیکرٹریٹ

مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ یہیں رسول اللہؐ صحابہ کرام کی تربیت کیا کرتے تھے، انہیں تعلیم دیتے اور ہر معاملے میں ان کی رہنمائی فرمایا کرتے تھے۔ یہی مسجد نبوی صحابہ کرام کی پہلی یونیورسٹی بھی تھی اور اسے ریاست کے مرکزی سیکرٹریٹ کی اہمیت بھی حاصل تھی۔ دیگر قبائل اور دوسرے ممالک سے آنے والے وفود سے ملاقات بھی آپؐ اسی مسجد میں کیا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ کی تمام شاہراہیں اور گلیاں مسجد نبوی یعنی اس سیکرٹریٹ تک پہنچتی تھیں تاکہ ضرورت مند بوقت ضرورت با آسانی اس سیکرٹریٹ تک پہنچ سکیں اور انہیں کوئی دشواری نہ ہو۔ آج چودہ سو سال بعد بھی حکومتوں کا مرکزی سیکرٹریٹ بنایا جاتا ہے اور ایسے مقام پر بنانے کو ترجیح دی جاتی ہے کہ

جہاں پہنچنا سب کے لیے آسان ہو۔اس عمارت تک پہنچنے والی شاہراہیں بھی خصوصی طور پر کشادہ بنائی جاتی ہیں۔

مفت علاج معالجہ

۱۴۰۰سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ کے حکم سے مسجد نبوی کے صحن میں صحابہ کرام کے علاج معالجے کی سہولت کا بندوبست کیا گیا تھا۔ چنانچہ جو بیمار ہوتا وہ مسجد میں پہنچ جاتا جہاں اس کا علاج نہایت توجہ سے کیا جاتا۔

آج چودہ سو سال بعد بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں عوام کو مفت علاج معالجے کی سہولت بہم پہنچانا حکومت کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے۔

درختوں کی اہمیت

۱۴۰۰سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ نے صحابہ کرام کو مدینہ میں درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا تھا اور درخت اگانے کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اور یہاں تک فرمایا تھا کہ اگر کوئی پودے لگاتا ہے اور اس میں سے چڑیاں یا کوئی انسان یا کوئی جانور کھالے تو یہ اس کسان کے لیے صدقہ بنتا ہے (راہ عمل ص ۱۱۵) گویا کسان کی فصل اس کے لیے موجب ثواب واجر ہے اگرچہ وہ فصل کا پھل خود اپنے ہاتھوں سے کسی کو نہ دے۔اگر کوئی پرندہ یا کوئی جانور یا انسان یا مسافر اس کے علم واذن کے بغیر کھالے تو بھی اس کا اجر کسان کو ملے گا۔زمانہ جاہلیت میں عموماً فاتح افواج مفتوحہ علاقوں میں درختوں کو کاٹ دیتی تھیں یا آگ لگا دیا کرتی تھیں۔آپؐ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جنگ کے موقعوں پر بھی درختوں کو بلا جنگی ضرورت اور حکمت عملی کے نہ کاٹا جاتا تھا اور نہ ہی جلایا جاتا تھا۔

آج عالمی درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔گرمی شدید سے شدید تر ہوتی جارہی ہے۔ہم نے درختوں کو کاٹ کاٹ کر ان کی جگہ آسمان سے باتیں کرنے والی بلند و بالا عمارات اور ٹاورز تعمیر کر کے اپنے لیے مسائل کھڑے کر لیے ہیں۔آج ماہرین زراعت و ماحولیات کی تجاویز کے پیش نظر مختلف نوعیت کی شجر کاری اور ''درخت اگاؤ'' مہمات شروع کی جارہی ہیں۔

مارکیٹ میں سہولیات

۱۴۰۰سو سال پہلے کی بات ہے کہ ایک شخص نے مدینہ کے بازار میں بھٹی لگائی۔آپؐ کا گزر ہوا تو آپؐ نے پسند نہیں فرمایا اور اس سے فرمایا کہ تم بازار بند کرنا چاہتے ہو؟ اور پھر فرمایا کہ شہر سے باہر جا کر بھٹی لگاؤ۔یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ آپؐ نے نہ تو اس کے پیشے کو برا کہا اور نہ اس کی تضحیک کی۔بلکہ فرمانے کا مقصد تھا کہ بیچ بازار میں بھٹی کی تپش اور دھواں بازار میں سے گزرنے والے راہگیروں، دکان داروں اور گاہکوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔دھوئیں کی وجہ سے عمومی فضا بھی مکدر ہو گی۔چنانچہ اسے حکم دیا کہ وہ اپنا کاروبار اس طرح جاری رکھے کہ دوسروں کے لیے باعث آزار نہ ہو۔

آج چودہ سو سال بعد دنیا کو اس ارشاد مبارک کی حکمت خوب سمجھ میں آگئی ہے۔چنانچہ بڑے بڑے شہروں میں رہائشی علاقوں اور بازاروں سے باہر دور باقاعدہ انڈسٹریل زونز بنانے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

۱۴۰۰سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ کے حکم کے مطابق خرید و فروخت میں سہولت کی غرض سے شہر کے وسط میں مرکزی مارکیٹ بنائی گئی تھی جس کا نام ''سوق مدینہ'' تھا۔آج چودہ سو سال بعد ہم جانتے ہیں کہ اس شہر کی قدر و اہمیت زیادہ ہوتی ہے جس شہر میں مرکزی مارکیٹ یا بازار موجود ہو چونکہ گردونواح کے قصبات اور دیہات کے لوگ اور چھوٹے موٹے تاجر ضروریات زندگی کے حصول کے لیے ایسے شہر میں کہ جس شہر میں مرکزی مارکیٹ موجود ہو وہاں جانا زیادہ پسند کرتے ہیں اس طرح وہ شہر خوب ترقی کرتا ہے۔آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ مارکیٹوں کو ائیر کنڈیشنڈ کرنے اور ان میں تھکان دور کرنے کے لیے اطمینان سے کرسیوں یا دیگر نشستوں پر بیٹھنے کا اہتمام اور ٹھنڈے گرم مشروبات کی سہولتیں مہیا کرنے کا رجحان بھی بڑھتا جارہا ہے۔

۱۴۰۰سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ کے حکم سے سوق مدینہ پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں لگایا گیا تھا اور حکم دیا گیا تھا کہ مرکزی بازاروں پر ٹیکس نہ لگایا جائے۔

آج چودہ سو سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ڈیوٹی فری شاپس قائم کرنے کا کاروبار اور رجحان فروغ پا رہا ہے۔ ڈیوٹی فری شاپس نہایت کامیابی سے چل رہی ہیں۔

۱۴۰۰ سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ نے ذخیرہ اندوزی کرنے سے سختی سے منع فرمایا تھا۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے:

" الجالب مرزوق و المحتکر ملعون

ترجمہ: ''وہ شخص جو اشیاء ضرورت کو نہیں روکتا بلکہ وقت پر بازار میں لاتا ہے تو وہ اللہ کی رحمت کا مستحق ہے اور اسے اللہ رزق دے گا، اور وہ شخص جو احتکار کرتا ہے وہ لعنت کا مستحق ہے''۔ (راہ عمل از مولانا جلیل احسن ندویؒ ص ۱۰۵ بحوالہ سنن ابن ماجہ، عمرؓ)

احتکار کے معنی ہیں ضرورت کی اشیاء کو روک لینا اور بازار میں نہ لانا اور قیمتوں کے خوب چڑھنے کا انتظار کرنا اور جب قیمتیں چڑھ جائیں تو مال کو باہر نکالنا۔ اس طرح اس مصنوعی قلت سے جب قیمتیں چڑھ جائیں تو ضرورت مند گاہکوں سے خوب روپیہ بٹورنا۔

آج دنیا کو اس ارشاد مبارک کی حکمت خوب سمجھ میں آ گئی ہے۔ چنانچہ مختلف حکومتوں نے ضروریات زندگی کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے اور بازاروں میں دستیابی کو یقینی بنانے کے لیے مختلف ناموں سے بڑے بڑے محکمے قائم کر رکھے ہیں جو ذخیرہ اندوزی پر کنٹرول کرنے کے لیے تجارتی مراکز اور تاجروں کے گوداموں میں اکثر چھاپے مارتے رہتے ہیں اور ذخیرہ اندوز تاجروں کو سزائیں سناتے رہتے ہیں۔

اگر اس ارشاد رسولؐ پر صدق دل سے عمل کیا جائے تو دنیا میں کسی چیز کا اور خصوصاً غذائی اشیاء کا کبھی بحران پیدا نہ ہو۔

نماز فجر و عصر کے بعد سونا

۱۴۰۰ سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اللہؐ نے صحابہ کرام کو نماز فجر اور نماز عصر کے بعد سونے سے منع فرما دیا تھا۔ آج میڈیکل سائنس کی جدید تحقیق بھی یہ بتاتی ہے کہ ان اوقات میں سونا صحت کے لیے مضر ہے۔ چنانچہ آج ڈاکٹر زصاحبان ان اوقات میں سونے کی بجائے چہل قدمی کا مشورہ دیتے ہیں اور ان اوقات میں سونے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

سود اور سٹے کی ممانعت

۱۴۰۰ سو سال پہلے کی بات ہے کہ رسول اکرمؐ نے سٹے بازی اور سودی لین دین سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس میں نقصان ہی نقصان ہے۔ آج دنیا نے اس کا تجربہ کر لیا ہے اور اب رفتہ رفتہ اکثر بنک اسلامی اور بلاسود بنکاری کے نظام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر دنیا مالیاتی اور معاشی بحرانوں سے بچنا اور IMF کے چنگل سے نکلنا چاہتی ہے تو اسے سٹے بازی اور سودی لین دین کو ترک کرنا ہوگا۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے سود کا قلع قمع کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنے چچا کا سود معاف کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں بھی کچھ ایثار و قربانی سے بہر حال کام لینا پڑے گا۔

☆.....☆.....☆

خاص مضمون

سرکشی پر آمادہ انسانیت کو

قدرت کی تنبیہہ

پروفیسر خواجہ مسعود

ایک نظر نہ آنے والے جرثومے کے آگے دنیا کی طاقتیں بے بس ہوگئی ہیں۔ آیئے ہاتھ اٹھائیں کہ یہ وقتِ دعا ہے

جب سے یہ دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے مختلف اوقات میں مختلف اُمتوں پر آزمائش اور ابتلا کے دور آتے رہے ہیں اور دردناک عذاب بھی نازل کیے جاتے رہے۔ یہ انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ ہدایت کا راستہ بھی اختیار کرتا رہا ہے لیکن انسانوں کی اکثریت سرکشی پر آمادہ رہی ہے۔ قرآن پاک میں بارہا ذکر آیا ہے کہ جن امتوں اور قوموں نے اللہ اور اللہ کے پیغمبروں کی تعلیمات کو ٹھکرایا اور نافرمانی کی، بار بار کی تنبیہہ کے باوجود ایمان نہ لائے اور شیطان کی پیروی جاری رکھی ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرت ناک عذاب نازل کیے گئے۔

قومِ ہود، قومِ لوط، قومِ ثمود، قومِ عاد اور سب سے بڑھ کے قومِ حضرت نوحؑ ان سب کے قصے قرآن پاک میں موجود ہیں۔ ان سب کو نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ ان کی بستیاں ملیا میٹ کر دی گئیں۔ پھر بڑے بڑے خدائی کے دعوے کرنے والے بھی دنیا میں آئے۔ نمرود، فرعون، شداد اور قارون، جو خود خدائی کے دعوے کر بیٹھے اور خدا کے احکامات کو یکسر نظر انداز کیا۔ کسی کو اپنی طاقت اور اقتدار پر گھمنڈ تھا، کسی کو اپنی دولت پہ، اپنے جاہ وجلال پہ۔ وہ خود زمین پر خدا بن بیٹھے لیکن پھر ان کا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔ فرعون اور اس کا زبردست لشکر سمندر کی لہروں میں غرق ہو گیا۔ نمرود کی خدائی کو ایک ننھے سے حقیر مچھر نے شکست دے دی اور شداد اپنی تعمیر کردہ جنت کو دیکھنے گیا لیکن ایک قدم جنت کے اندر تھا اور ایک باہر کہ موت کا فرشتے نے آ لیا۔ قارون کو جس کے خزانوں کی چابیاں کئی اونٹوں پہ لادی جاتی تھیں اُسے اپنی بے تحاشہ دولت پر غرور تھا لیکن انجام کیا ہوا، نہ دولت کام آئی نہ غرور۔ آخر کار زمین کے اندر دھنسا دیا گیا۔ ساری دولت، سارے خزانے یہیں دنیا میں دھرے رہ گئے، کچھ کام نہ آیا۔

بڑی بڑی شان والے قیصر و کسریٰ آئے، دارا و سکندر آئے ان سب کا غرور انہیں لے ڈوبا۔ وہ سب یہ بھول گئے تھے کہ سب سے اوپر ایک عظیم ہستی ہے جو اس کائنات کی حقیقی خالق و مالک ہے اور اس کی رضا کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ وہ سب صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

لاکھ دارا و سکندر ہو گئے
آج بولو وہ کہاں سب گئے
آئی ہچکی موت کی اور سو گئے

ہر کسی کا ہے بسیرا چند روز
ہے بہار باغ دنیا چند روز
دیکھ لے اس کا تماشا چند روز

تاریخِ عالم شاہد ہے کہ جب بھی انسان نے حد سے زیادہ سرکشی کی تو قانونِ قدرت حرکت میں آتا ہے۔ آج بھی اللہ اور اس کے پیغمبروں کی تعلیمات کو بھولی ہوئی انسانیت کو ایک جھٹکا دیا گیا ہے جو کسی شدید زلزلے سے بھی زیادہ لرزا دینے والا ہے۔ یہ ہے کرونا وائرس کا جھٹکا!

چین کے ایک صوبے میں جنم لینے والا یہ خطرناک وائرس پہلے چین میں تباہی مچاتا رہا۔ پورے چین کو ہلا کے رکھ دیا۔ پھر چین سے نکلا تو دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا میں پھیل گیا۔ آج پوری دنیا اس خطرناک کرونا وائرس سے خوف زدہ ہے۔ لاکھوں لوگ اس موذی وائرس کا شکار ہو چکے ہیں اور ہزاروں لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ دنیا کے بہت ترقی یافتہ یورپی ممالک، امریکہ، کوریا، آسٹریلیا، جاپان، بھی اس موذی وائرس کے

شکنجے میں آ گئے ہیں۔امریکہ جیسی سپر پاور بھی اس کے آگے بے بس نظر آتی ہے۔ایشیا کے بیشتر ممالک بھی اس وائرس کا شکار ہو چکے ہیں۔خود ہمارا اپنا پیارا وطن پاکستان بھی اس موذی وائرس سے نبرد آزما ہے۔

کرونا وائرس نے انسانوں کو اتنا خوف زدہ کر دیا ہے کہ لوگ گھروں تک محدود ہو کے رہ گئے ہیں۔بازاروں کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ سڑکیں ، پارک ریستوران ،تفریح گاہیں سب بڑے بڑے شاندار میگا مال سُونے پڑے ہیں۔یہاں تک کہ ہمیں مساجد میں آ کر نماز پڑھنے سے بھی روک دیا گیا۔حتیٰ کہ خانہ کعبہ جہاں ہر وقت شب و روز ہزاروں پروانے طواف کرتے نظر آتے ہیں وہاں بھی لوگوں کا جانا بند کرنا پڑا۔یہ دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔

مساجد جنہیں آباد کرنے کی تاکید کی گئی ہے، مجبوراً اور احتیاطاً ان میں نمازیوں کی تعداد کو بے حد محدود کرنا پڑا۔حتیٰ کہ جمعۃ المبارک کی نمازیں بھی گھر پر ادا کرنے کی ہدایت دی گئی۔ قیامت کی ایک ہلکی سی جھلک ہے کہ قیامت کے روز بھائی بھائی کو نہ پہچانے گا، باپ بیٹے کو، بیٹا باپ کو نہ پہچانے گا۔نفسانفسی ہوگی.....آج ہم مجبور ہو گئے ہیں۔ بھائی، بھائی کے گھر ملنے نہیں جا سکتا.....کوئی کرونا وائرس کا شکار ہو گیا تو گھر والے بھی اُس سے دُور دُور رہیں گے ..... یہاں تک کہ لوگ اپنے عزیزوں کے جنازے میں جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

دنیا میں طاقت کا کھیل دیکھیں تو مزید عبرت کا سامان نظر آتا ہے۔امریکہ جیسی سپر پاور جو اپنی طاقت کے نشے میں آج بدمست ہو چکی ہے اُس نے ترقی کی بے شمار منازل طے کیں۔بڑے بڑے مہلک ہتھیار بنا لیے۔ہائیڈروجن بم ،تباہ کن میزائل.....آج بھی بڑی طاقتیں خدائی اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی ہیں، جیسے امریکہ ساری دنیا کو اپنی مرضی سے چلانا چاہتا ہے۔سب ممالک پہ اپنا تسلط چاہتا ہے۔بڑی بڑی طاقتیں اپنی ترقی پر تو نازاں ہو گئیں لیکن وہ یہ بھول گئیں کہ ایک عظیم طاقت ہے جو سب سے برتر اور اعلیٰ ہے۔خدائے بزرگ و برتر کی ذات!

گزشتہ دو دہائیوں سے امریکہ کی پالیسیوں پر نظر ڈالیں تو واضح پتہ چلتا ہے کہ امریکہ تمام اسلامی ممالک کو کمزور کرنا چاہتا ہے، انہیں تباہی سے دوچار کرنا چاہتا ہے۔اُس نے عراق جیسے خوشحال اسلامی ملک کو تباہ کیا۔کبھی عراق کو ایران سے لڑا دیا کبھی اسے کویت پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا اور پھر ایک دن خود عراق پر حملہ آور ہو گیا اور عراق کو کمزور کر کے رکھ دیا۔اُس کے اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا۔لیبیا پر حملہ کر کے انتشار اور زوال کی دلدل میں پھنسا دیا۔وہاں کے لیڈر کرنل قذافی اور اس کے بیٹوں کو بے دردی سے قتل کیا۔مصر جیسے خوبصورت ملک کو تباہی سے دوچار کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ایران کو دنیا میں تنہا اور بے بس کر کے رکھ دیا۔لیکن آفرین ہے ان ممالک کے رہنماؤں پر جنہوں نے اپنے اپنے وطن کی مٹی میں ہی جان دے دی ، ملک سے فرار نہیں ہوئے۔کرنل قذافی نے بھی اپنے ملک لیبیا میں جان دی۔صدام حسین کو عین عید کے دن صبح سویرے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔مصر کے حسنی مبارک کو زنجیروں میں جکڑ کے موت کا شکار کیا گیا۔یہ بھی ماضی قریب ہی کی بات ہے کہ امریکہ نے افغانستان پہ حملہ کر دیا۔وہاں خون کی ہولی کھیلی۔لاکھوں افغان قتل ہوئے ، مارے گئے اور تیس لاکھ کے قریب افغانی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی لاکھوں افغانستانی پاکستان میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔لیکن اپنے بے تحاشا اسلحہ بارود، اور اتحادی افواج کے باوجود امریکہ افغانیوں کو شکست نہیں دے سکا، ان کے جذبہ حریت کو ختم نہیں کر سکا اور آج ان سے صلح کے مذاکرات کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

امریکہ نے شام جیسے پرامن اور مقدس مقامات والے ملک پر بھی اپنے پنجے گاڑے اور وہاں جنگ کی ہولناک آگ بھڑکا دی۔لاکھوں شامی مارے گئے اور لاکھوں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

کبھی امریکہ نے ویت نام جیسے غریب ، کمزور اور چھوٹے سے ملک سے بھی ٹکر لی تھی۔بے تحاشا اسلحہ اور بے شمار فوج کے ساتھ وہاں کئی سال حملے کرتا رہا۔لیکن اُس نہتی قوم نے گوریلا جنگ میں امریکہ کو نا کوں چنے چبوا دیئے اور ایک دن امریکہ وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔نہ جانے امریکہ بار بار ایسی ذلت سے دوچار ہوتا ہے لیکن پھر بھی سبق نہیں سیکھتا۔ آج فلسطین مظلوم ہے۔یمن اور شام میں خانہ جنگی ہے۔

کبھی مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے بڑے فخر سے کہا تھا ''ہم

فرعون کی اولاد ہیں اور ہمیں اس پر فخر ہے''۔اس کا یہی غرور اُسے لے ڈوبا اور اسرائیل کے ہاتھوں مصر کو شکست سے دو چار ہونا پڑا۔کبھی روس نے بھی افغانستان پر حملہ کر دیا تھا لیکن ذلت آمیز شکست کے بعد وہاں سے پسپا ہونا پڑا اور پھر ایک دن خود اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ وہاں اقتصادی بدحالی کا یہ عالم ہو گیا کہ لوگ قطاروں میں لگ کے ڈبل روٹی لینے آتے تھے۔ بے تحاشا مہنگائی ہو گئی۔

آج دنیا کو قرآن میں بیان کردہ اس واقعہ پر یقین آ جانا چاہیے جو رسول پاکؐ کی پیدائش سے چند سال پہلے عرب میں پیش آیا تھا جب ابرہہ بادشاہ خانہ کعبہ کو تباہ کرنے کی نیت سے مکہ پہ چڑھ دوڑا۔اُس کے لشکر میں ہزاروں ہاتھی تھے۔اسے یقین تھا کہ وہ کعبہ کو مسمار کر دے گا لیکن انجام یہ ہؤا کہ اللہ نے ابابیل بھیجے جن کی چونچوں میں ننھے ننھے کنکر تھے۔ وہ انہوں نے ہاتھیوں پر گرائے۔ان کنکریوں نے بموں کا کام کیا اور جس ہاتھ پر بھی وہ کنکر پڑتا وہ بھسم ہو جاتا۔اس طرح ابرہہ کا سارا لشکر تباہ ہو گیا۔

پہلے تو شاید غیر مسلم اس واقعہ پر یقین نہ کرتے ہوں لیکن آج کل کرونا وائرس جیسے مہلک وائرس کو دیکھ کر ضرور اس واقعہ پر ایمان لے آئیں گے کہ اگر ان دیکھے حقیر وائرس انسانوں کو تباہ کر سکتے ہیں تو پھر خدا کے بھیجے ہوئے ابابیل کسی لشکر کو تباہ کیوں نہیں کر سکتے۔

کبھی ملکہ برطانیہ نے دعویٰ کیا تھا کہ سلطنت برطانیہ میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔اس وقت سلطنت برطانیہ دنیا کے بے شمار ممالک میں پھیلی ہوئی تھی لیکن آج تو غالباً سورج سلطنت برطانیہ میں سال بھر میں کبھی کبھی ہی طلوع ہوتا ہے اور انگریز سورج اور دھوپ کو دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو جاتے ہیں ۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ہر کمالے را زوال۔ انسان بڑے بڑے دعوے تو کرتا ہے،لیکن تدبیر کند بندہ،تقدیر کند خندہ!

جب ایک بہت بڑا اور قیمتی بحری جہاز ٹائی ٹینک تیار ہؤا تو اس کی پیشانی پر بنانے والوں نے یہ الفاظ لکھوائے ''ٹائی ٹینک،ایک ایسا طاقتور شپ جیسے قدرت بھی تباہ نہیں کر سکتی'' (نعوذ باللہ)۔لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ یہ دیوہیکل جہاز اپنے پہلے ہی سفر میں سمندر میں ایک بہت بڑے برفانی تودے سے ٹکرا گیا اور دو ٹکڑے ہو کر گہرے یخ بستہ سمندر کے پانیوں میں ڈوب کر نشانِ عبرت بن گیا۔سب انسانی دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

آج دنیا کا انسان پھر سرکشی پر آمادہ ہے۔خدا اور خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات کو یکسر بھلا دیا گیا ہے۔مادر پدر آزادی کو شعار بنا لیا گیا ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں تو یہاں تک بیہودگی کا مظاہرہ کیا گیا کہ مردوں کی مردوں کے ساتھ شادی کو جائز قرار دے دیا گیا۔جبکہ اسی ایک علت کے باعث قوم لوط کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔اجازت دے دی گئی ہے کہ لڑکا لڑکی اپنی مرضی سے بغیر نکاح کے اکٹھے زندگی گزار سکتے ہیں ۔ افسوس وہ یہ یاد رکھتے کہ اس فعل کی سزا کتنی دردناک ہے۔بعض یورپی ممالک میں ایسے کلب بنائے گئے جہاں لباس پہن کر جانا ممنوع قرار دیا گیا کہ انسان اپنے فطری انداز میں وہاں آتے ، بے شرمی کی انتہا ہے۔نہ جانے اتنی ترقی یافتہ قومیں ایسی پستی کا شکار کیوں نظر آتی ہیں ۔ یہ اخلاقی پستی ہی تو ہے!

افسوس آج ہمارے اپنے ملک میں کئی اخلاقی کمزوریاں اور برائیاں موجود ہیں ۔کئی دکاندار کم بھی تولتے ہیں ۔جھوٹ بول کر سودا فروخت کرتے ہیں ۔کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ عام ہے حتیٰ کہ دوائیوں میں بھی دھوکہ دہی سے کام لیا جاتا ہے اور انسانی جانوں اور صحت کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔جھوٹ عام بولا جاتا ہے۔رشوت لی جاتی ہے۔ بلیک مارکیٹنگ ہے،ذخیرہ اندوزی ہے،ناجائز منافع خوری ہے۔گوشت اور دودھ جیسی غذاؤں میں بھی دھوکہ اور فریب سے کام لیا جاتا ہے۔خود غرضی ، بد دیانتی ، غیبت ، چوری، ڈاکہ دوسروں کا حق مارنا ، قطع رحمی ، ناانصافی ، قتل و غارت ، والدین کی نافرمانی ، الغرض بے شمار اخلاقی برائیاں ہمارے معاشرے میں پنجے گاڑ چکی ہیں ۔کبھی ایک ایک برائی کی وجہ سے قوموں پر عذاب الٰہی نازل ہوتا تھا لیکن آج تو یہ ساری برائیاں ہمارے اندر موجود ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے اور ہم اپنی حالتِ زار اور معاشرے کی حالت غور کریں اور اصلاح کی جانب گامزن ہوں۔

آج ساری دنیا کو کرونا جیسے مہلک وائرس کا سامنا ہے۔دنیا کی

بڑی بڑی طاقتیں اس کے آگے بے بس نظر آتی ہیں۔ انسان کے بنائے ہوئے مہلک ہتھیار تو نظر آجاتے ہیں لیکن یہ مہلک وائرس تو آنکھ سے نظر بھی نہیں آتا لیکن کتنا تباہ کن ہے۔ اس وائرس نے دنیا بھر کے انسانوں کو اس یقین کا راستہ دکھایا ہے کہ انسان بے شک بے تحاشا ترقی کر جائے لیکن وہ غرور اور اکڑ سے کام نہ لے اور یہ کبھی نہ بھولے کہ ایک عظیم ہستی ہے جو اس سارے نظامِ کائنات کو چلا رہی ہے۔ اس کے ایک اشارے پر کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔ کُن فیکون والے اللہ تعالیٰ کے لیے تو کوئی امر بھی ناممکن اور مشکل نہیں۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر استغفار کریں۔ خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ دنیاوی تدابیر کی بے شک ضرورت ہے لیکن سب سے زیادہ خلوصِ دل اور خلوص نیت سے استغفار کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری خطائیں ہمارے گناہ بخش دے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کو بھلا دیں گے تو ہم اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے خود ہم ہی ذلت کے گڑھے میں گر جائیں گے۔

یہ کرونا کی وبا انسان کے لیے ایک معمولی سا جھٹکا ہے۔ ہمیں آج بھی سنبھل جانا چاہیے اور اسے ایک ہلکی سی وارننگ سمجھنا چاہیے۔ گمراہی کے راستوں پہ چلنا ترک کر دیں۔ خدا اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے صاف ستھرے راستے پر چلیں۔ صاف ستھری اور پاکیزہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں۔

پختہ ایمان رکھیں کہ ایک ایسی ہستی ہے جو نظام کائنات چلا رہی ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ ہم بلاشبہ ترقی کریں لیکن یہ کبھی نہ بھولیں کہ ہم اس کے بندے ہیں جس نے ہمیں دنیا میں پیدا کیا، وہی موت دے گا اور مرنے کے بعد ہم نے اسی کے حضور پیش ہونا ہے۔ ہم سرکشی و نافرمانی ترک کر کے استغفار کریں۔ رمضان المبارک میں تو ہمارے لیے زبردست موقع ہے کہ ہم اپنے خدا کو راضی کر لیں۔ تمام بیماریوں اور گناہوں سے بچنے کے لیے سچے دل سے توبہ کریں۔ خدا عظیم و برتر تو بہت رحیم و کریم ہے۔ وہ کبھی بھی انسان کی تباہی نہیں چاہتا۔ وہ تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ انسان سے پیار کرنے والا ہے۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس کی رحمت کا طلب گار تو بنا کے دیکھیں۔ ہم اسے پکاریں وہ ہماری پکار سنے گا۔ وہ ہماری شہ رگ سے زیادہ ہمارے قریب ہے۔ اگر ہمارا اس پہ ایمان ہو جائے تو ہم کبھی بھی گناہ کی طرف مائل نہ ہوں۔ ہمارا ایمان ہو کہ کوئی دیکھے نہ دیکھے ہمارا خدا تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔

ظالم اور فرعون حکمران مودی کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے کہ اس نے کشمیر کے مظلوم مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ انہیں کئی مہینوں سے ان کے گھروں میں محصور کر کے رکھا ہوا اور کشمیر جنت نظیر کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ آج ہم دعا کریں اور تدبیر بھی کریں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ہنود کی چیرہ دستیوں اور ظلم و استبداد سے نجات عطا فرمائے آمین۔

آج وقت دعا ہے استغفار کے ساتھ خدا کرے یہ رمضان سارے عالم اسلام اور تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت کا وسیلہ بن جائے اور کرونا وائرس سے ہمیں نجات عطا فرمائے۔ حسب سابق رمضان المبارک میں حرمین شریفین کی رونقیں بحال ہوں۔ مسلمانان عالم حج کی سعادت بھی حاصل کر سکیں۔ دنیا شر، بیماریوں اور تباہیوں سے پاک صاف ہو جائے، آمین ثم آمین۔ آخر میں اس مصرع کے ساتھ اختتام کرتا ہوں

کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے

☆.....☆.....☆

دمِ وداع

ننھے تارو جگمگاؤ جگمگاؤ آج اور
دھیرے دھیرے مسکراؤ مسکراؤ آج اور
شاخسارو اولیں شب ہے اٹھاؤ بھی رباب
لوریاں گا کر سناؤ ہاں سناؤ آج اور

گو اسی طرح شفق کی اوٹ سے جھانکے گی شام
دیدۂ انجم مگر پُرآب ہو جائیں گے کل
نیند میں ڈوبے ہوئے جھونکوں کی آہٹ کی قسم
آہ یہ لمحات جو اک خواب ہو جائیں گے کل

یہ گھنیرے پیڑ یہ چاروں طرف نزدیک و دور
یہ برستی بدلیاں یہ جھومتی گاتی ہوئی
کھُل رہی ہو دھیرے دھیرے جیسے چشمِ مے گسار
مستیاں ہی مستیاں چاروں طرف چھاتی ہوئی

آہ یہ گلشن کے ہر غنچہ میں اک موتی سا دل
جیسے پلکوں کے تلے رخسار پہ ننھا سا تل
کھوئی کھوئی نیم خوابیدہ نگاہوں کی طرح
نیند میں ڈوبا ہوا سا اُف جہانِ آب و گل

ہاں یہ سب کچھ تو اسی طرح رہے گا اک مگر
دور ہو گی ان سے ان کو چاہنے والی نظر
یہ تو آئیں گے یونہی پر کون دیکھے گا انہیں
یہ تمنائے دلِ بے تاب یہ شام و سحر

چمن بیدل لاہور

غزل

اک عمرِ مسافت کا صلہ گرد بڑی دھول
دامن میں کوئی ایک بھی پھل ہے نہ کوئی پھول

پکا ہے بہت جسم کا اور روح کا رشتہ
ہم ایسا سمجھتے تھے ہوئی ہم سے بڑی بھول

تقدیر میں تقسیم بھی ہے جمع و ضرب بھی
پھر ساری دعا کیوں ہوئی تفریق میں مقبول

کیا ایسی کہانی، کہ نہ تانے ہوں نہ بانے
کیا ایسا فسانہ، ہو بنا عرض بنا طول

جلتی ہے مری وادیِ کشمیر مگر سب
اللہ کی تسبیح و عبادت میں ہیں مشغول

اُس وقت عبادت کا کوئی لطف و مزا کیا
جب ہلنے لگے جسم کے اعضا کی ہر اک چول

منھ دیکھتے رہ جائیں گے کیا قیس کیا مجنوں
گر میں نے اڑادی ذرا دامن پہ جمی دھول

کیوں اور کوئی دار پہ کھنچتا کہ میں خود تھا
منصف کی نظر میں میں ہی قاتل میں ہی مقتول

منجدھار میں تنکا بھی ہے ایسا ہی کہ دیکھے
اک ڈوبنے والا کوئی کشتی کوئی مستول

وہ واؤ جو خود، خود میں ہوتا ہے، میں ایسے
معروف کہانی میں تری ہوں کبھی مجہول

اندر سے میں کیا ہوں نہ حبیبؔ اُس کو خبر تھی
صورت سے بہت وہ بھی لگا تھا مجھے معقول

حبیب الرحمٰن

غزل

دکھ درد کا اب یہ عالم ہے رونے پہ ہنسنا آوت ہے
کچھ ہم دل کو سمجھاوت ہیں کچھ دل ہم کو سمجھاوت ہے

کیوں اوڑھ کے سر سے پیر خزاں ہم سیر چمن کو آ نکلے
ہر کانٹا گھاؤ لگاوت ہے، ہر غنچہ آنکھ دکھاوت ہے

بچوں کے بھولے چہروں پر انجانے دکھ کے سائے ہیں
نہ ٹھوڑی تارہ چمکت ہے نہ ماتھے چاند سوہاوت ہے

اک دن تنہا پا کے خود کو ہم نے خود سے یہ پوچھ لیا
کیوں پہن کے مانگے کا چہرہ اتراوت ہے اٹھلاوت ہے

چاہت میں تری چلتے چلتے یہ کیسے موڑ پہ آ پہنچے
نہ اپنوں سے جی لاگت ہے نہ غیر ہی دل کو بھاوت ہے

پچھلوں کو رو رو یاد نہ کر زندہ لوگوں کی سیوا کر
ہے دنیا کی یہ ریت میاں کوئی آوت ہے کوئی جاوت ہے

تجھ مجھ میں بسا کرونا ہے، گھر گھر میں رونا دھونا ہے
انجان نگر سے موت بانسریا بوجھو کون بجاوت ہے

نجمہ یاسمین یوسف

غزل

کہتا ہے ہر اک بجھتا دیا اور ہی کچھ ہے
اب کے جو چلی ہے وہ ہوا اور ہی کچھ ہے

کب میری زمیں پر نہیں ٹوٹیں ہیں بلائیں
اس بار مگر میرے خدا اور ہی کچھ ہے

دیتی ہے درِ عرش پہ فوراً ہی وہ دستک
جو دل سے نکلتی ہے دعا اور ہی کچھ ہے

ہر داغِ معاصی کو مٹا دے گی، جو میری
ان آنکھوں میں چھائی ہے گھٹا اور ہی کچھ ہے

پھل کھانے پہ اتری مری خلعت، یا بتادے
یہ اُس کی سزا تھی یا خطا اور ہی کچھ ہے

ہیں سارے پرانے وہی کردار، یا تیری
دیکھوں تو کہانی میں نیا اور ہی کچھ ہے

میں بھی ذرا دیکھوں تری ریکھاؤں کے اندر
ہے نام بھی میرا یا لکھا اور ہی کچھ ہے

جب جب بھی کہا رحم، ہوئیں رحمتیں، لیکن
اس بار حبیبؔ حکمِ خدا اور ہی کچھ ہے

حبیب الرحمٰن

صبیحہ نبوت

پانچویں بیٹی

جب پانچویں بیٹی نے جنم لیا تو کچھ لوگ خوش اور کچھ اداس ہو گئے۔خوش ہونے والوں میں ابا سرفہرست تھے اور اداس لوگوں میں دادی جان جو چھپ چھپ کر آنسو بہا رہی تھیں۔کبھی منہ موڑ کر دوپٹے سے آنسو پونچھ لیتیں اور کبھی دروازے میں کھڑی ہو کر رو لیتیں۔ان کی اس بے چینی کو حامد نے محسوس کیا تو انہیں ایک طرف لے جا کر بٹھایا، پانی کا گلاس دیا پھر کچھ دیر بعد بات شروع کی اور ان کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا۔

''بیٹا اس دفعہ پھر بیٹی ہوگی.....کاش بیٹا ہو جاتا!''

حامد نے کہا''تو اماں ایسی کون سی بات ہے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے ہم اس سے دعا کرتے ہیں کہ جو بھی ہو نارمل صحت مند انسان ہو، نیک اور صالحہ ہو۔دیکھیں نا کتنی پیاری ہے میری یہ بیٹی بھی''۔

انہوں نے ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن ان کو تسلی کہاں ہوتی۔بولیں:

''بیٹا! اگر بیٹا ہوتا تو تیرا بازو بنتا.....گھر کی رونق ہوتی.....اس کے بچے تیرے آنگن میں کھیلتے، گھر بھرا ہوتا''۔

''یہ تو آپ کی سوچ ہے اماں! آجکل بیٹے بھی کہاں رہتے ہیں، وہ بھی چلے جاتے ہیں اور گاہے بگاہے آ گئے تو اس کی اہمیت کوئی نہیں۔ ویسے بھی رازق تو اللہ تعالیٰ ہے اس نے جو لکھ دیا ہے وہ ہمیں ملتا رہے گا''۔حامد نے ماں کے آنسو پونچھے۔

''اماں بیٹیاں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہیں اور اچھی مائیں اس قوم کا سرمایہ بنتی ہیں۔ہاں بیٹیاں چلی ضرور جاتی ہیں لیکن وہ صرف جسمانی طور پہ ماں باپ سے جدا ہوتی ہیں ذہنی طور پر نہیں۔ان کا دل ماں باپ کے لیے ہی دھڑکتا ہے بلکہ وہ پورے خاندان کی ہم دم و دم ساز ہوتی ہیں خواہ وہ کہیں بھی ہوں ان کی نظریں ہمیں ہی تلاش کرتی ہیں''۔

حامد نے اماں کو تسلی دی تو انہوں نے کچھ سوچا، اپنے اطراف نظر ڈالی تو خیال آیا کہ ہاں واقعی حامد ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔

وہ ماضی حال اور مستقبل کی گتھیوں میں الجھ گئیں۔اپنے بچپن اور جوانی پر نظر ڈالی تو لگا یہ سب تو حامد نے میرے لیے ہی کہا ہے۔میں بھی تو ایسی ہی تھی..... بالکل ایسی ہی! بلکہ آج بھی میرا دل اپنوں کے لیے ہی دھڑک رہا ہے۔نہ اب ماں باپ ہیں نہ چاہنے والے۔نہ وہ گھر ہے نہ وہ ماحول نہ وہ روایات نہ وہ رسم و رواج.....لیکن میری نظریں تو اسی ماحول میں گھومتی رہتی ہیں، کبھی خواب میں اور کبھی حقیقت میں۔

اور اس کے بعد تو اکثر ہونے لگا۔وہ غور کرتیں کہ وہ ذہنی طور پہ کتنا اپنے ماضی میں رہتی ہیں۔سوچتے سوچتے وہ اکثر اس گھر میں پہنچ جاتیں جو ستر سال پہلے انہوں نے چھوڑا تھا، جو ان کا اپنا تھا۔جہاں ماں باپ کا پیار اور بہن بھائیوں کی کبھی ختم نہ ہونے والی لڑائیاں اور دوستیاں تھیں۔جہاں چھ خاندان ایک ہی گھر میں آباد تھے۔سب کی خوشیاں اور غم ایک ہی تھے۔وہ پورے خاندان کی لاڈلی تھیں۔بڑی بیٹی ہونے کے ناطے انہیں اور بھی رتبے حاصل تھے۔لیکن اپنی معصومیت لاابالی پن اور بے فکری نے کبھی یہ احساس ہی نہ ہونے دیا۔جب شادی کے بعد ایک دور کے رشتہ دار نے ان کے ایک سسرالی سے یہ کہا کہ یہ لڑکی تو ہمارے خاندان کی ناک تھی، اس وقت شعور جاگا۔اچھا ایسا تھا؟ کیا یہ سب میرے لیے تھا؟ تو اپنی اہمیت کا کچھ اندازہ ہوا۔

پڑھائی کے زمانے میں بھی محبتیں ملتی رہیں۔دوستوں سے استادوں سے اپنوں سے غیروں سے آس پاس والوں سے۔ہر طرف محبت کے دیے روشن تھے۔اس وقت اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا محبتیں اور تعلق رواداری کا شکار تھے۔کوئی احساس تھا نہ کسی بات کا تجربہ ویسے بھی زندگی میں ہر طرح کے مراحل آتے رہے، انہیں میں ایک سال ہجرت کا

بھی تھا جب بیاہ کر نئے گھر میں آ گئیں۔ لیکن اپنوں سے دوری نے کبھی دور نہ ہونے دیا۔

آج حامد نے بس جھنجھوڑ ہی دیا۔ سوچ رہی تھیں اس نے ٹھیک ہی تو کہا ہے کہ بیٹیاں جسمانی طور سے ماں باپ سے جدا ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ گھر جہاں ستر سال پہلے بچپن گزرا تھا وہی گھر تحفظ دیتا ہے اس کے در و دیوار اس کے باغ اس کا تالاب اس کے میدان اور اس کے مکین آج بھی روح کا حصہ ہیں۔ پھر تعلیمی دور آیا تو وہ اسکول جو اپنا تھا وہاں کے دوست احباب اور استاد۔ اس خیال نے جیسے ماضی میں کھڑکی کھول دی۔ انہوں نے سامنے میدان میں نظر ڈالی، یہ تو میرا اسکول ہے! اس کا وہ میدان جہاں پر ہر سال کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے، ڈرامے اور ٹیبلو ہوتے تھے، مباحثے ہوتے تھے اور انعامات ملتے تھے۔ اسمبلی میں ہر صبح لب پہ آتی ہے دعا کی گونج تھی۔

لیکن اب نہیں ہے۔ اس کی جگہ پر ہسپتال ہے اور ہسپتال میں میں ہوں۔ ہماری کلاسوں میں مریضوں کے بیڈ ہیں جہاں طالب علموں کے بجائے مریض ہیں۔

اسکول کے پانچ سال تو کیسے گزر گئے تھے یہ پتہ بھی نہیں چلا مگر خوشی اس بات کی تھی کہ ماضی پھر لوٹ آیا تھا۔ خصوصاً گزشتہ پندرہ سولہ سالوں میں ان یادوں نے نہ تو بیماری کا احساس ہونے دیا نہ تکلیف کا۔ مگر وہ خاموش انجانی بیماری اندر ہی اندر پھیل گئی تھی ابھی کل ہی تو ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ کینسر آخری سٹیج میں ہے پھر آج وہ بات بھی یاد آئی کہ ماں کی دعائیں تسبیح کے ان دانوں کی طرح ہوتی ہیں جو انگلیوں کے پوروں سے پھسلتے رہتے ہیں۔ اب ماں تو نہیں لیکن ان کا تصور ضرور ہے اور ان کی دعا .....تسبیح کے دانے..... مستقل گر رہے ہیں۔

اسی لمحے بیڈ کو حرکت ہوئی، سارے خیالات ہوا ہو گئے۔ گھوم کر دیکھا تو نرس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''آپ کو آپریشن تھیٹر لے جانا ہے''۔

وہاں کیا ہوگا؟ دل نے زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ جب پتہ ہے کینسر آخری اسٹیج میں ہے پھر آپریشن کی کیا ضرورت؟ لیکن زندگی کے فیصلے خود نہ کرنے والا انسان دوسروں کے ہاتھوں یوں ہی مجبور ہوتا ہے۔ وہ صرف سوچتا ہی رہتا ہے ہوتا وہی ہے جو دوسرے چاہتے ہیں۔

دھیان بٹانے کے لیے پھر کھڑکی کی طرف دیکھا تو اسٹیج پر اقبال کی نظم عروس شب پر ٹیبلو ہو رہا تھا۔ رات کی دلہن سیاہ لباس میں ملبوس تھی، آس پاس پریوں کا ڈیرا تھا اور ناظرین پس منظر میں لگی ہوئی نظم سن رہے تھے، محظوظ ہو رہے تھے اور داد دے رہے تھے۔

اسی لمحے نرس نے آواز دی۔ تمام خیالات و تصورات آپریشن تھیٹر کی خاموشی میں گم ہو گئے۔ کھڑکی بند تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا یا بینائی میں۔ کانوں میں بچوں کا شور و غوغا تھا۔ دعائیں دینے اور آنسو بہانے والے نہ جانے سب کہاں غائب تھے۔ باہر صرف پانچویں بیٹی آنکھوں میں جل تھل دوپٹے سے منہ چھپائے ہوئے بیٹھی تھی۔

ایک بے کلی سی دماغ کو مسلسل کرید رہی تھی۔ اب کہاں جانا ہے .....اب کون سا ٹھکانہ ہے!

☆.....☆.....☆

قانتہ رابعہ

خوف کی سیڑھی پر آخری قدم

فجر کی اذان سے پہلے مؤذن نے آواز چیک کرنے کے لیے مائیک پر پھونک ماری جو مسجد کی دیوار کے ساتھ خواب غفلت میں گہری نیند سوئی آمنہ کے کانوں میں بگل کی طرح سنائی دی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھی..... یہ کیسی آواز تھی!

جونہی مؤذن کی اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی وہ ہوش کی دنیا میں آئی۔ ابھی تو اس کی آنکھ لگی تھی، ابھی تو کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ گرمیوں کی رات ہوتی ہی کتنی مختصر ہے جیسے پلک جھپک لو یا پانی کا گھونٹ منہ سے حلق تک لے جاؤ..... اور رہی سہی کسر مچھر پوری کر دیتے۔ پر آج تو وہ واقعی تھکی ہوئی تھی۔ میاں انگلینڈ میں مقیم تھا۔ جانے کو وہ بھی جا سکتی تھی مگر بوڑھے ساس سسر کو چھوڑا جا سکتا تھا نہ ساتھ لے جایا جا سکتا تھا، سو وہ اس مشکل کام کو عبادت سمجھ کے آسان کرتی آ رہی تھی۔ سسر اللہ کو پیارے ہوئے۔ اب ساس اور بچوں کا ساتھ تھا، اور انہی کے دم سے آمنہ کے آنگن میں رونق تھی۔

بچوں نے کڑھی چاول کی فرمائش کی تھی اور وہ کڑھی چاول یا ساگ بھات جیسے مہا دیسی پکوانوں سے بہت دور بھاگتی تھی۔ چوبیس گھنٹے کے دن رات میں سے بیس تو ان کی تیاری میں لگ جاتے پھر ساس کا حکم تھا کہ انہیں پکوان نہ کہو یہ تو موسم کی سوغات ہیں جو سارے محلے میں بانٹ کے کھائی جاتی ہیں۔ ساگ تو چولھے پر رکھ کے بھول جاؤ بس کام اسے کاٹنے اور گھوٹنے کا مشکل ہوتا ہے۔ کاٹنے کے لیے وہ بازار سے جدید مشین لے آئی تھی، گھوٹنے کا کام بھی کسی طور کر ہی لیتی۔ ہاں کڑھی بنانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد چمچ ہلاؤ..... پھر پکوڑوں کی تیاری گرمیوں کے سڑے موسم میں انتہائی بیزار کن کام تھا..... اس کے بس میں ہو تو خالی بیسن لسی میں گھول کے کڑھی بنا دے۔ اور اس نے ایک دفعہ بنائی بھی..... ساس کچھ دیر تو چمچ سے الٹ پلٹ کے پکوڑے تلاش کرتی رہیں۔ جب تلاش بسیار کے بعد بھی پکوڑا ہاتھ نہ لگا تو ماتھے پر چودہ بل ڈالے گرج کے بولیں۔

''ائے آمنہ..... تو نے آج رنڈی کڑھی بنالی؟''

آمنہ اللہ میاں کی گائے کچھ دیر تو ہونق بنی رنڈی کڑھی کے معنی دماغ میں لائن حاضر کرتی رہی۔ پھر جب کم بخت مارا مطلب سمجھ میں آیا تو منہ نیچے کر کے کھس کھس کر کے ہنستی رہی۔ ساس نے پکوڑوں کے نہ ہونے کا اتنا دکھ نہ کیا جتنا اس ناہنجار بہو کی ہنسی نے..... منہ آمنہ کی طرف کر کے حکم جاری کیا۔

''آج کے بعد کڑھی جب بھی بنے گی تو بینگن، پالک، آلو، انار دانہ اور میتھی شامل کر کے بنائی جائے گی''۔ پھر پندرہ منٹ انہوں نے راجپوتانے کی کوفتہ کڑھی کے فضائل بیان کیے۔

اصل میں پکوڑے بناتی تو نامراد تینوں بچے پلیٹیں ہاتھ میں لیے بھک منگے بنے ماں کی ٹانگوں میں گھس گھس جاتے..... جونہی وہ کفگیر سے پکوڑے نکالتی پکوڑے کڑھی کی بجائے بچوں کی پلیٹوں سے پیٹوں میں منتقل ہو جاتے..... وہ کفگیر بھر بھر کڑاہی سے پکوڑے نکالتی رہتی اور بچوں کا لینے کا شغل میلہ جاری رہتا..... کڑھی آرام سے تین سے چار گھنٹے لے لیتی۔ پھر اس کے بعد کا نازک مرحلہ..... اڑوس پڑوس میں باؤل بھر بھر کے بھجوانے کا..... پسینہ پونچھتی جب کھانے بیٹھتی تو بھوک ہی ختم ہو جاتی۔ چونکہ کمر درد کی مریضہ تھی تو کڑھی چاول والا دن اس کا دھڑن تختہ ہی کرنے کا ہوتا تھا۔

آج بھی ایسے ہی ہوا۔ بچوں کو مغرب کے بعد ہوم ورک کروا کے سامنے پارک میں بھیجا۔ خود بچوں کے یونیفارم دھو دھلا کے ڈرائیر سے

نکال کے استری کیے۔ جوتے پالش کرنے کے بعد پانی کی بوتلیں بھر کے فریج میں رکھیں تو ٹانگیں اکڑ کے لوہا بن چکی تھیں۔ بچوں سے باتیں کرتے ہوئے سوئی تو نماز پڑھی تھی نہ میاں کو کال کرنے کے میسج کے جواب میں کال کی تھی۔ اب جب مؤذن کی پھونک سے آنکھ کھلی تو بہت دیر تک اپنے تیز تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اے سی والے کمرہ میں سونے کے باوجود سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوبی تھی۔ ٹانگیں بری طرح لرز رہی تھیں۔ دھڑکن کبھی انتہائی تیز اور کبھی بہت سست ہو جاتی۔

یا وحشت.....کیا یہ خواب تھا؟

وہ نئے سرے سے دہشت زدہ ہوگئی۔ وہ کسی مصیبت میں ہے۔ لوگوں کو مدد کے لیے پکارتی ہے مگر سخت سراسیمگی کی حالت میں اس کی آواز حلق میں پھنس جاتی ہے۔ وہ گلی میں جاتی ہے۔ چہار جانب ہو کا عالم ہے۔ خواب میں جب وہ مایوس ہو کے گھر لوٹتی ہے تو گھر میں ایک چارپائی پر مردہ وجود پڑا ہے۔ اس کا منہ کسی رنگین کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے..... بچے چارپائی کے اردگرد بیٹھے ہیں اور رونے کی بجائے ٹکر ٹکر دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ دیوانہ وار چیختی ہے کون مر گیا؟ باقی سب کہاں ہیں؟ مگر جواب سے پہلے ہی اس کی آنکھ مائیک کی بگل نما پھونک سے کھل گئی۔

یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ خواب میں کس کی میت تھی۔ اس کا گھر خالی کیوں تھا۔ بچے رو کیوں نہیں رہے تھے۔ گلیاں بازار سنسان کیوں تھے۔ اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ اذان ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینا چاہی۔

''میں نے عشا کی نماز نہیں پڑھی تھی.....اور میں کون سا اتنی نیک پاک ہوں کہ میرا خواب سچا ہو!''

مگر دھڑ دھڑ کرتا دل بہت دیر تک بے قابو رہا۔ اس نے غسل خانے میں خوب دل لگا کے وضو کیا لمبی رکعت والی نماز ادا کی۔ خشوع خضوع سے دعا مانگی۔ باورچی خانے میں قدم رکھنے سے پہلے صدقہ نکالا۔ اس کے باوجود خواب اور اس کے اثرات سارا دن اس پر حاوی رہے۔ وہ چپکے چپکے آنسو پیتی رہی۔ بچوں کی سکول روانگی کے بعد اس نے میاں سے فون پر ڈیڑھ گھنٹے کی بحث بحثی کی۔

''بس جب یہ ایمان ہے کہ رزق مقدر میں لکھا ملتا ہے تو یہاں کیا اور وہاں کیا.....مجھ اکیلی جان سے سارے دکھ نہیں جھیلے جاتے۔ پہلے جاگنے کے دوران کی ٹینشن تھی اب سوتے میں بھی ڈر ڈر کے اٹھتی ہوں.....آپ کی والدہ انتہائی لاغر ہو چکی ہیں روٹی کا لقمہ بھی منہ میں توڑ کے ڈالنا پڑتا ہے۔ ابا کے انتقال پر آپ وعدہ کر کے گئے تھے کہ میں ان شاء اللہ اگلی مرتبہ سب کچھ وائینڈ اپ کر کے آؤں گا.....''

ان سب گلے شکووں کے جواب میں وہی مسکراہٹ جس پر شادی کے شروع دنوں میں وہ پھسل جاتی تھی اب زہر لگنے لگی تھی۔ فون ختم ہوا تو روز کے کام۔ بچوں کے یونیفارم دھو کے پریس کرنا، اُبلا دودھ ٹھنڈا کر کے فریج میں رکھنا، ساس کے پمپر لگانا وغیرہ وغیرہ۔

رات سونے کے لیے لیٹی تو خواب ہنوز حواسوں پر سوار تھا۔ زبان سوکھی اور گلا درد محسوس کر رہا تھا۔ ان سولہ سترہ گھنٹوں میں ایک لمحہ کے لیے بھی خواب اس کو بھولا نہیں تھا۔ تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے سر پر خوف بن کے ناچ رہا تھا۔

اگلے دن بیدار ہوئی تو کیفیت کچھ فرق تھی۔ اس کی بھابھی ناروے سے پاکستان آئیں تو چھ سات دنوں کے لیے اس کے گھر بھی آئیں۔ خوب ہلا گلا رہا۔ پھر چھوٹی بہن کی شادی کی تیاری کے لیے میکے جانا پڑا۔ میکے سے واپسی پر بچوں کی ڈیٹ شیٹ منہ چڑا رہی تھی۔ دسمبر کی چھٹیوں کے فوری بعد پرچے شروع ہونا تھے۔ ساس کو اس نے اتنے دنوں کے لیے ان کی بھانجی کے ہاں بھیج دیا تھا۔ انہیں لے کے آئی تو وہ بخار میں تھیں۔ کون سا خواب اور کہاں کا خواب.....اب ہدف ایک ہی تھا، بچوں کے سالانہ امتحانات میں نمایاں کامیابی اور بیمار ساس کی دیکھ بھال.....

بسا اوقات وہ میاں کو بھی میسج کر دیتی کہ مجھے بے جا فون کر کے تنگ نہ کیا جائے.....خدا خدا کر کے امتحانات اور جنوری کا مہینہ اکٹھے ختم ہوئے۔ اس کی اکلوتی نند حلیمہ بھی ماں کی تیمارداری کے لیے آنا چاہتی تھی مگر بھتیجے بھتیجیوں کے امتحانات کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ ادھر آمنہ کا گرین سگنل ملا، ادھر وہ نائٹ کوچ سے چاروں بچوں کے ہمراہ لاہور پہنچ گئی۔ ہر آنے والا

دن سردی میں اضافے کی اطلاع لاتا۔ روز ہی پیکجز اور امپوریم مال جانے کے پروگرام بنتے اور بنتے بنتے خود ہی ختم ہو جاتے۔ کراچی والے نازک مزاج کہاں ایسی کڑاکے کی سردی کے عادی ہوتے ہیں.....لحاف میں منہ چھپائے آدھا دن گزر جاتا، باقی ہیٹر کے سامنے..... اس مرتبہ کی سردی پر تو پنجاب والے بھی دہائی دے رہے تھے۔ ایسے میں رات کو جب حلیمہ مونگ پھلی کے چھلکوں کے ڈھیر میں سے ایک آدھ دانہ ڈھونڈ رہی تھی اس کے میاں کا فون آیا۔

''پیکنگ کر لو میں تمہاری بکنگ کروا رہا ہوں.....حالات بہت خراب نظر آ رہے ہیں مجھے۔''

''کیوں؟ کیا ایم کیو ایم دوبارہ آ گئی.....'' حلیمہ نے ٹھٹھا لگایا۔

''بے وقوف تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔ کیا تمہیں کچھ نہیں علم؟'' وہ غرایا۔

''اخبار آمنہ بھابھی کے آتا نہیں اور ٹی وی خراب.....رہا موبائل وہ بیچارہ بچوں کے ہاتھوں میں۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے پنجاب میں تو''۔

''لاک ڈاؤن کی افواہیں پھیل رہی ہیں تم بس تیاری پکڑو'' میاں نے بات ہی ختم کر دی۔

''پھوپھو لاک ڈاؤن کیا ہوتا ہے؟'' چار سالہ فہد پھوپھو حلیمہ کی گود میں گھسا۔

''پھوپھو ہمیں بھی بتائیں'' عامرہ اور شانی بھی پھوپھو کے لحاف میں گھسے۔

''بچو یہ کرفیو کی ہی ایک قسم ہے'' پھوپھو نے جمائیاں روکتے بتایا۔

''پھوپھو کرفیو کیا ہوتا ہے؟'' سات سالہ عامرہ نے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

پھوپھو نے مختصر لفظوں میں کرفیو کا معنی بتایا۔ دماغ نہ ہو سکنے والی خریداری میں تھا۔ وہ ہمیشہ سال بھر کی بیڈ شیٹس گرمیوں کے کپڑے اور دس طرح کی چیزیں یہاں تک کہ مرچ مصالحے بھی لاہور سے لے کے جاتی۔ پہلے کوئی مسئلہ نہیں تھا شہر کے بیچوں بیچ لکشمی چوک سے پانچ سات منٹ کے فاصلے پر گھر تھا۔ آمنہ بھابھی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں ہوتیں اور وہ اکیلے ہی خریداری کر کے واپس بھی آ جاتی۔ ابا کے انتقال کے بعد وہ گھر ورثے کی تقسیم میں فروخت ہو گیا تو بھائی نے کسی نئی سوسائٹی میں گھر لے لیا۔ کہنے کو جدید طرز تعمیر سو طرح کی سہولتیں مگر خریداری کے لیے سوسائٹی سے باہر مین روڈ تک پہنچنے میں بیس منٹ لگ جاتے۔ اسی شش و پنج میں کہ بازار کل کتنے بجے جایا جائے اس کی آنکھ لگ گئی۔

ایک ڈیڑھ کا وقت ہو گا جب لینڈ لائن کی چیختی چنگھاڑتی آواز نے آمنہ کو بیدار کیا۔ فون قریب ہی پڑا تھا، سوئی ہوئی آواز میں اس نے سلام کیا۔

''آمنہ بھابھی حلیمہ سے کہیے میں نے ابھی چار بجے والی ٹرین کی بکنگ کروادی ہے بچوں کو اٹھائے اور کریم یا اوبر والوں کو بلوا لے..... حالات اچھے نہیں ہیں''۔

حلیمہ نے بھی اندازہ تو لگا ہی لیا تھا۔ وہ بھی شال لپیٹے پہنچ گئی، ریسیور پکڑ کے سلام کے بعد جھلا کر بولی۔

''ایسی بھی کیا مصیبت آن پڑی ہے کہ ایک دن کی بھی مہلت نہیں دے رہے۔ کل رات کی بکنگ کروا دیں''۔

''بات کو سمجھو۔ میں نے ابھی چار بجے کی بکنگ کروادی ہے اب دو بجنے میں دس منٹ ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پہنچنے اور سامان اتارنے رکھنے کا بھی گھنٹے بھر کا مارجن رکھو''۔

''لیکن ایسی بھی کیا ایمرجنسی ہے آپ بھی ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ کہا تو ہے کل رات کی.....''

''بیٹھی رہو پھر ہمیشہ کے لیے۔ نیک بخت لاک ڈاؤن میں سب سے پہلے ٹرینیں اور جہاز بند کر رہے ہیں.....زندگی اب قید میں بدل جائے گی۔ تمہیں کیا معلوم میں نے کس مشکل سے تم لوگوں کی ٹکٹوں کا بندوبست کیا ہے، تم حالات کی نزاکت کو سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ نہیں آنا چاہتیں تو مت آؤ۔ بس بچوں کو بھجوا دو مہربانی فرما کے''۔

میاں نے فون بند کیا تو حلیمہ کو بھی ہوش آیا۔ سوئے ہوئے بچوں کو

گھسیٹ گھساٹ کے پلنگ سے اتارا، غسل خانے بھیجا۔ سامان کچھ ملا کچھ نہیں اور ماں کو ملے بغیر ہی ریلوے اسٹیشن روانہ ہوگئی۔

آمنہ اسے دروازے تک رخصت کر کے اندر آئی۔ اب کہاں کی نیند! اس نے تہجد کے نوافل کی نیت باندھ لی۔ فجر کی نماز سے فارغ بھی نہ ہوئی تھی کہ موبائل فون پر بیپ ہوئی۔ اس کا میاں حسن انوار فون پر وڈیو کال کی خبر لیے موجود تھا۔ آمنہ نے بتایا کس طرح حلیمہ کو اچانک بلا لیا حالانکہ اس کا میاں تو ٹھنڈے مزاج کا ہے پتہ نہیں کیوں اتنے غصے میں تھا۔

حسن انوار کی شکل پر تھکاوٹ کی ان کہی تحریر تھی۔ اس نے لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ بے خبری بھی نعمت ہے۔ جس اندیشے نے اس کی پردیس میں نیندیں اڑا رکھی ہیں اس کی بیوی کو اس کی الف ب بھی نہیں معلوم..... مختصر الفاظ میں اس نے چین اور اٹلی کے حالات بتائے کراچی میں چند کیسز کا بتایا اور ماسک سینی ٹائزر مہینے بھر کا راشن جمع کرنے کی تاکید کی۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے پوچھا۔

''کیا تمہیں واقعی نہیں علم کہ کرونا کیا ہے؟''

''نہیں ناں! اخبار آتا نہیں ٹی وی خراب موبائل بچوں کے پاس ہے''۔

''بہرحال تم موبائل فون اپنی تحویل میں رکھو بچوں کو باہر جانے سے روکو میں نے بھی ڈاکومنٹس دے دیے ہیں سیٹ کی بکنگ کے لیے مگر میرا مسئلہ یہ ہے کہ پاسپورٹ بدلوانا پڑے گا۔ ایک تو وہ ایکسپائر ہو جائے گا ایک دو ماہ میں، دوسرے داڑھی رکھنے سے ایشو بن سکتا ہے۔ تم دعا کرنا امی کا خاص خیال رکھنا''۔

کال ختم ہوئی تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ کاموں کی فہرست مرتب کرتے ہوئے اچانک اسے جاگرز کی فرمائش یاد آئی۔ حلیمہ نے کہا تھا جب بھی بھائی سے بات ہو تو جاگرز ضرور منگوائیں۔ کل پر ٹالا تو بھول ہی نہ جائے، اس نے لگے ہاتھوں ابھی فرمائش نوٹ کروانے کی نیت سے میاں سے فون پر بات کے لیے نمبر ملایا۔ پہلی مرتبہ ہی کال اٹینڈ کر لی گئی۔ اس نے جاگرز کا کہا تو میاں بے ساختہ بولا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟''

''کیوں مجھے بھول جاتا ہے ناں اس لیے فوری کال ملالی۔'' آمنہ نے کہا۔

''کال کی بات نہیں، میرے دونوں پاکستانی دوست پاکستان جا چکے ہیں۔ میں تین دن سے کمرے میں بند بیکری کی چیزوں پر گزارہ کر رہا ہوں..... پورے شہر کا لاک ڈاؤن ہو چکا ہے۔ تم دعا کرو میرا پاسپورٹ والا مسئلہ حل ہو جائے تو میں بھی اپنے ملک میں ہی آ جاؤں۔ تم حالات کی نزاکت کا اندازہ نہیں کر پا رہی ہو۔'' اس نے فکرمندی سے کہا۔

''کیا کہا آپ نے انگلینڈ میں بھی لاک ڈاؤن ہے کیا؟'' آمنہ کا سانس بند ہوا۔

''تو اور کیا..... امریکہ افریقہ ساری دنیا گھر میں محصور ہو چکی ہے۔ مجھے یہاں رہ کے تم لوگوں کی امی کی بہت ٹینشن ہے۔ امی کو کچھ ہو گیا تو.....'' حسن کی آواز بھرا گئی۔

''اپنے موبائل میں تمام محلے والوں کے اور ایمرجنسی کے سارے نمبر محفوظ کر لو۔'' حسن نے کال کاٹ دی۔

آمنہ نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ خوف کی سیڑھی پر آمنہ کا یہ پہلا قدم تھا۔ اس نئی کالونی میں گنتی کے دو چار ہی گھر تھے۔ سامنے والوں کا نمبر اس کے پاس محفوظ تھا، اس نے سوچا عالیہ چچی سے ہی باقی لوگوں کے نمبر لے لے گی۔ عالیہ چچی کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے ان کے میاں عابد چچا کا نمبر ملایا سلام دعا کے بعد حال پوچھا۔

''دعا کرو بیٹے..... حالات جلدی ٹھیک ہو جائیں۔ ہم تو سوات آ گئے ہیں بیٹے کے پاس، اکیلے کیا کرتے وہاں.....!'' ان کی آواز میں نمی سی تھی۔

''اوہ میرے خدایا آپ لوگ سوات چلے گئے، کب؟'' وہ بے قراری سے بولی۔

عابد چچا اور عالیہ چچی تو سات غیر ہوتے ہوئے اپنوں سے بڑھ کے اپنے تھے۔ اپنا بل جمع کرواتے تو آمنہ کا لے جاتے۔ سودا سلف کی

فہرست ہر وقت تیار رکھنے کی تلقین کرتے اور سودا لے کے آتے تو پائی پائی کا حساب کر کے رقم تھماتے۔ عابد چچا نے فون بند کیا تو اس کے گلے میں گرہیں سی پڑ گئیں۔ خوف کی سیڑھی پر یہ اس کا دوسرا قدم تھا۔ دس منٹ کے بعد وہ ناشتہ بنا رہی تھی تو نیویارک سے نائلہ بھابی کا فون آیا۔ وہ بچوں کی طرح بلک کے رو رہی تھیں۔ آمنہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

''بھابھی کیا ہوا؟ خیر ہے؟''

''خیر ہی تو نہیں ہے۔ ہم سب کورن ٹائن میں ہیں۔ ہمارے سامنے والی تینوں بلڈنگ میں کرونا کے مریض تھے۔ دو کی رات ڈیتھ ہو گئی ہے۔ آمنہ بہت بے بسی ہے پردیس میں۔ وینٹی لیٹر کم پڑ گئے ہیں۔ کل ایک مسلم ڈاکٹر کی بھی ڈیتھ ہوئی ہے''۔

بھابھی رو رہی تھیں اور آمنہ کی ٹانگوں میں سے جان نکل رہی تھی۔ اسے اپنا نیچے والا حصہ فیل پا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے دم ہو کے گر پڑی۔ ساس پچھلے کئی دنوں سے کھوں کھوں کر رہی تھیں۔ مہمانداری میں سو بد پرہیزیاں ہو جاتی تھیں۔ اس کا وجود ڈھے گیا۔

خوف کی سیڑھی پر یہ تیسرا قدم تھا۔

ہائے اگر اسی پچاسی سالہ ساس کو کچھ ہو گیا۔ وہ سب کچھ اکیلی جان کیسے کرے گی! اور ساتھ ہی اس کا پانچ ماہ پرانا خواب چھم سے اس کے سامنے آ گیا زہریلی ناگن کی طرح.....لہراتا.....بل کھاتا.....اس کے تالو میں بھی جیسے خوف جم گیا تھا۔

سکولوں سے چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ بازار منڈی سب بند۔ اس کا دل بند ہونے کو آ جاتا۔ بار الٰہی میری بوڑھی ساس پر رحم کرنا، وہ گڑگڑاتی۔ بھابھی کے الفاظ ایک منٹ میں دس مرتبہ کانوں میں سیسہ ڈالتے۔ آمنہ نیویارک پر خدا کا قہر ٹوٹ پڑا ہے!

وہ چائے کے لیے دودھ کے انتظار میں تھی کہ دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ دودھ والا غفورا دودھ دینے کے بعد پیسے مانگ رہا تھا۔

''لیکن ابھی تو دو دن قبل پیسے دیے ہیں''۔ وہ حیرت سے بولی۔

''جی باجی جی دیے ہیں مگر کل سے میں دودھ نہیں لا سکتا۔ ہمارے قصبے میں دو لوگوں کو کرونا ہو گیا ہے جی، پولیس کے سپاہی چپے چپے پر نگرانی کے لیے کھڑے ہیں، ناکے لگے ہیں جی.....میری معذرت ہے''۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔

دو دن کے پیسے دے کے جب وہ لاؤنج میں آئی تو ساس کو متلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ابکائیاں لے رہی تھیں۔ ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ بچے بیزار تھے۔ روز روٹی سالن کھا کھا کے تنگ آئے ہوئے.....نوڈلز پاستا برگر اور بیکری کے سامان کی فرمائش کرتے۔ ساس کو سو بخار تھا۔ آمنہ نے چادر اوڑھی اور بڑی بیٹی کو گھر میں دھیان رکھنے کی تلقین کر کے مارکیٹ روانہ ہوئی۔ ساری گلیاں سونی تھیں۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ دور دور تک رکشے کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ کریم ہی بلا لیتی۔ اب کوشش کی مگر کریم پر کوئی کار ظاہر نہ ہوئی۔ بیس بائیس منٹ چلنے کے بعد ایک پاں پاں کرتا پھٹیچر رکشہ نظر آیا۔ آمنہ نے رکنے کا اشارہ کیا اور قریبی مارکیٹ کے لیے کرایہ پوچھا۔

''پانچ سو روپے باجی''۔ دانت نکوستے ہوئے رکشہ ڈرائیور نے کہا۔

''خدا کا خوف کرو سو روپے سے زیادہ نہیں ہے کرایہ''۔ وہ کلس کر بولی۔

''تو جو سو روپے میں جاتا ہے اس پر چلی جاؤ جی''۔ وہ بدتمیزی سے بولا۔

مین روڈ پر ہر دو چار قدم کے بعد رینجرز کے سپاہی اور پولیس کے سپاہی وائرس سے جنگ لڑنے کے لیے بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ کپڑے کی نہ جوتے کی کوئی دکان کھلی ہوئی نہ تھی۔ رکشہ والے نے مارکیٹ کے باہر رکشہ روکا۔

''اترو بی بی''۔

بی بی ابھی اتری بھی نہیں تھی کہ بندوق بردار چاروں طرف سے امڈ پڑے۔

''بی بی! سارا بازار بند ہے۔ اور ماسک کہاں ہے؟ سینی ٹائزر نہیں لگایا؟ عورت ذات ہو کیا کہوں، خود بھی مرو گی ہمیں بھی مرواؤ گی.....چلو واپس.....پانچ بجے مارکیٹ بند ہو جاتی ہے۔ اتنی بے خبر ہو دنیا اور اس کے حالات سے؟''

تند لہجہ میں موٹی توند والا گرج کے بولا اور آمنہ کو رکشے سے نہ اترنے دیا۔خوفزدہ ہو کے اسی رکشے میں وہ واپس آئی تو رکشے والے نے آنے جانے کا کرایہ سات سو روپے لیا۔سات سو روپے کرائے کی مد میں خرچ کر کے دھیلے کی خریداری کیے بغیر گھر پہنچ گئی۔

جونہی وہ گھر میں داخل ہوئی بچے برق رفتاری سے آئے۔

''امی امی دادی اماں کو بہت الٹیاں آئی ہیں۔ان کو بخار بھی تیز ہے۔کھانسی بھی بہت ہوگئی ہے''۔

وہ گم سم کھڑی تھی۔خواب تالیاں پیٹتا ڈھول بجاتا لڈی ڈالتا ڈھم ڈھم کرتا اسے استہزائیہ انداز سے دیکھ رہا تھا۔وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ساس کو دیکھ رہی تھی۔

''امی کیا دادی اماں کو کرونا ہو گیا ہے؟''فہد سرگوشی میں بولا۔

اس کا سانس خشک ہو رہا تھا۔

''امی امی ابو کا فون.....''دادی کو بھول کے وہ اب موبائل فون ہاتھ میں لیے ماں کی طرف آیا۔

''جی کیسے ہیں آپ؟''آمنہ کو اپنی آواز سات سمندر سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''امی کیسی ہیں؟''حسن انوار کی آواز میں صدیوں کی تھکاوٹ تھی۔آمنہ نے بلا کم و کاست ساری کیفیت بتا دی۔

''کیا؟''حسن کی آواز میں دکھ ہی دکھ تھا۔

''بخار کتنا ہے؟''

''ایک سو دو.....کھانسی بھی ہے''۔

''کھانسی بلغم والی تو نہیں''۔حسن چوکنا ہوا۔

''نہیں بلغم تو نہیں''۔

''شکر ہے خدایا.....بچے کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں بس آپ سنایئے نڈھال سے لگ رہے ہیں۔میرا خیال ہے بیکری کی چیزوں سے بھی دل اوبھ گیا ہوگا''۔آمنہ نے کہا۔

''نہیں مجھے ایک سو چار بخار ہے۔میں نے پوری کوشش کی میں پاکستان آ سکوں مگر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔آمنہ میں نے پورے دس دن سے وڈیو کال نہیں کی کیونکہ تم مجھے اس حلیے میں دیکھ نہ سکتیں.....میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے کرونا ہو گیا ہے آمنہ''۔حسن رو دیا۔

خوف کی سیڑھی پر آمنہ نے آخری قدم رکھا۔اس کا جی متلایا اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ گھاٹیاں پھیل گئیں۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں.....آپ کو کرو.....''وہ بیٹھتی چلی گئی۔

''آمنہ تم پریشان نہ ہو،جانے والے کم ہیں بچ کے واپس آنے والے زیادہ ہیں۔مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔میں پرسوں ایمبسی گیا تھا میری کھانسی سے ان کو شک ہوا فوری ٹیسٹ کروائے تو ابھی رپورٹ آئی ہے پوزیٹو.....گنتی کے چودہ دن ہیں آئسولیشن کے.....میں ان شاء اللہ جلد آ جاؤں گا۔میں تمہیں کبھی نہ بتاتا مگر ہاسپٹل میں سیل فون کی اجازت نہیں میں نے سوچا تم پریشان نہ ہو جاؤ''۔

حسن کچھ بول رہا تھا کہ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔آمنہ کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔جیسے بلیاں رو رہی ہوں،بہت سے جانور بھونک رہے ہوں۔پس منظر میں کسی کے بولنے کی آواز آئی فون کٹ گیا۔خواب مجسم شکل میں سامنے آ گیا تھا.....جنازہ کی چارپائی.....رنگین چادر سے منہ ڈھانپا ہوا.....ساس کی طبیعت شاید اب کچھ بہتر ہو گئی تھی،وہ تسبیح کے دانے پر دانہ گرا رہی تھیں۔منظر صاف شفاف سامنے تھا۔سہمے ہوئے بچے۔بند دروازے سونی گلیاں.....

آمنہ بیوہ ہو گئی۔کسی کی آواز سنائی دی۔

آمنہ عدت میں ہے.....دوسری آواز آئی۔

آمنہ کا شوہر جب مرا تھا کرونا کے دنوں میں.....

یتیم بچے.....ایک عفریت نے اس کے سر پر چابک مارا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتی نیچے گرتی چلی گئی۔اس کے منہ سے غوں غوں کی عجیب سی آواز نکلی۔بچے دوسرے کمرے میں تھے۔وہ نیچے بیٹھتی چلی گئی۔خون کی بڑی ساری الٹی اس کے اردگرد کی جگہ کو رنگین کر چکی تھی۔آوآوو کی آواز پر ساس اور بچے لپک کے آئے.....رہے نام اللہ کا!باقی رہنے والی ذات تو حق تعالیٰ کی ہے۔گوشت پوست کی آمنہ منٹ دو منٹ میں ماضی بن چکی تھی۔☆

ام ایمان

چہل قدمی

وہ پوری سڑک پر ٹہل رہا تھا جیسے سڑک پر نہیں بلکہ اپنے گھر کے ہرے بھرے لان میں ٹہل رہا ہو۔ ٹھہر ٹھہر کر درمیان میں ادھر اُدھر بھی نظر ڈالتا۔ سڑک زیادہ مصروف نہیں تھی لیکن پھر بھی سڑک تو تھی۔ لہٰذا کاریں اسکول بس اور موٹر سائیکل کا آنا جانا لگا تھا۔ لیکن اُسے اُن کی کوئی پروا نہیں تھی۔ سارے ڈرائیور خود ہی محتاط تھے۔

وہ مجذوب تو تھا شاید چرسی بھی ہو لیکن نہیں۔ چرسی کہاں اتنے ہٹے کٹے ہوتے ہیں۔ بھرا بھرا چہرہ، بڑھی ہوئی داڑھی، میل سے بھرے کپڑے، جیکٹ لیکن پھر بھی اس کی گندی جلد کہیں کہیں سے چمک چمک کر بتا رہی تھی کہ اس کا رنگ گندمی ہوگا۔ تیز چمکتی ہوئی آنکھیں .....اور میل سے اٹے لمبے بال.....شلوار کا سامنے کا پورا حصہ پھٹا ہوا تھا لیکن لمبی قمیص نے اس کا ستر ڈھانک رکھا تھا۔ پاؤں میں جو چپل تھی اس کی ایک چپل کا آگے کا حصہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کے پاؤں کی انگلیاں سڑک کو چھو رہی تھیں جب کہ دوسری چپل کا آگے کا حصہ ذرا سا جڑا ہوا تھا جو چلتے ہوئے وہ ادھر اُدھر ہو رہا تھا یقیناً کچھ دیر میں وہ بھی علیحدہ ہونے والا تھا۔ آخر اس مجذوب فقیر کی صحت کا راز کیا ہے؟ طاہر نے سوچا۔

ایک آدھ دفعہ پہلے بھی اُس نے اس فقیر کو سڑک پر چہل قدمی کرتے دیکھا تھا۔ طاہر نے پچھلے ہفتے سے ہی قریب کے باغ میں ڈاکٹر کے کہنے پر تیز گامی شروع کی تھی۔ کچھ دیر تیز چلنے کے بعد ہی اس کا سانس پھولنے لگا ڈاکٹر سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ ابھی صرف پانچ منٹ تیز گام چلیں پھر آہستہ چلیں اور آہستہ آہستہ اس وقت کو بڑھائیں۔ لیکن جیسے ہی آپ کا سانس پھولنے لگے آپ رفتار آہستہ کر لیں۔

''دیکھیے طاہر صاحب یہ قدرت کا اصول ہے۔ آہستہ آہستہ اور اعتدال کے ساتھ کوئی چیز بھی مستقل مزاجی سے کی جائے تو نتائج ضرور لاتی ہے'' ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر طاہر کی آنکھوں میں جھانکا۔

''اور دیکھیے اگر چہل قدمی کے ساتھ ساتھ آپ اردگرد پر بھی نظر رکھیں، دیکھیں اور غور کریں تو آپ کو چہل قدمی میں مزا آنے لگے گا اور جس چیز میں مزا آنے لگے تو وہ خود بخود کرنے کو دل چاہتا ہے۔ یوں چہل قدمی میں ناغہ نہیں ہوگا''۔

ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے طاہر نے چہل قدمی شروع کر دی تھی.....اور اردگرد پر نظر بھی۔ پچھلے دنوں ہلال پارک میں چہل قدمی کرتے ہوئے وہاں لگے بورڈ پر بھی نظر پڑی تھی۔ جہاں لکھا تھا کہ:

'' اکثر عظیم خیالات چہل قدمی کرتے ہوئے مفکرین کے ذہنوں میں آئے تھے''۔

''شاید میرے ساتھ بھی کبھی ایسا ہو''۔ یہ مقولہ پڑھ کر طاہر نے مسکرا کر سوچا تھا۔

ہلال پارک جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت پڑتی تھی۔ دور تھا لہٰذا طاہر نے اپنے قریب کے پارک جانا شروع کیا۔ جو پیدل کے راستے پر تھا۔ راستہ چلتے ہوئے بازار سے گزرنا ہوتا تھا۔ پھل سبزی کے ٹھیلے راستے میں پڑتے تھے چائے کے ڈھابے پر صبح پر اٹھے چائے کے لیے بھیڑ ہوتی تھی۔ راستے منظر اتنے دلچسپ ہوتے کہ طاہر کو راستے کی طوالت کا احساس ہی نہ ہوتا۔ ڈاکٹر کی بات پر عمل کرتے ہوئے وہ راستے کے سارے مناظر کو غور سے دیکھتا اور ان پر فکر کرتا ہوا چلتا جاتا۔

باغ میں گھاس پر پڑے شبنم کے قطرے آئینہ صورت نظر آتے لیکن دیر سے پہنچنے پر انہیں بادِ نسیم اڑا لے جاتی۔ پیلے رنگ کا گہرا سرمہ لگائے فاختاؤں کا جھنڈ ادھر سے اُدھر گھاس پر اُڑ اُڑ کر بیٹھتا اور چونچیں مارتا نظر آتا۔ گھاس اور مٹی میں نہ جانے ان کا پیٹ بھرنے کو کیا چیز ہوتی تھی۔ کوّے بھی کہیں کہیں اس شغل میں رہتے۔ کبوتروں کی ٹولی باغ کے

کونے میں بنی جاپانی طرز کی چھتوں پر موجود ہوتی جن کے نیچے بونائی پودوں کے گملوں کی قطاریں سجی تھیں جہاں شام کو بونائی پودوں کی تیاری کے لیے کلاس بھی لی جاتی تھی۔ ایک دفعہ طاہر نے بھی سرسری سی لی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا کہ پودوں کی جڑوں کو المونیم کے تاروں سے جکڑا جا رہا ہے تا کہ ان کی بڑھوتری کو روک کر انہیں بونے پودوں میں تبدیل کیا جا سکے۔ اس نے بیزاری سے سوچا، انسان بھی اپنے ذوق کے لیے کیا کیا حرکتیں کرتا رہتا ہے۔

باغ تک جانا تو ٹھیک رہتا مگر واپسی کا راستہ اسے بیزار کرتا تھا۔ کچھ تھکن سی بھی محسوس ہونے لگتی۔

''معاف کیجیے گا.....'' طاہر کو کسی نے متوجہ کیا

''جی کہیے'' وہ رکا

''کیا آپ میرے جوتے کا تسمہ باندھ دیں گے؟''

اچھے خاصے جوان آدمی کے منہ سے یہ سن کر طاہر کے ماتھے پر بل پڑے۔

''کیوں بھئی؟''

معاف کیجیے گا میں جھک کر خود اپنی لیسز نہیں باندھ سکتا کمر کا مسئلہ ہے ایک دفعہ جھک گیا تو سیدھا ہونا آسان نہیں اور یوں چلنے میں رپٹ کر گرنے کا خطرہ ہے۔

طاہر نے خاموشی سے جھک کر اس کے جوتے کی ڈوری باندھ دی اور ساتھ اسے جوتوں کے اندر ہی اُڑس دیا کہ کہیں پھر نکل کر اس کے لیے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

طاہر تسمہ باندھ کر کھڑا ہوا تو اس نوجوان نے اس کا انتہائی شکریہ ادا کیا۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جھلملا رہی تھی۔ طاہر نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا اور آگے بڑھ گیا وہ سوچ رہا تھا۔ کبھی ہم ان نعمتوں کے بارے میں یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ کوئی نعمت ہے جیسے نیچے جھک کر اپنے کام کر لینا!

واپسی میں اسے گلی کے کونے والے بنگلے کے گیٹ کے نیچے سے جھانکتے ایک چھوٹے سے بوانما کتے نے ہلکے سے بھونک کر متوجہ کیا۔ وہ گیٹ کی جالیوں سے نظر آ رہا تھا کہ روئی بھرے کھلونے جیسے اس کتے کو فیروزی چھوٹا سا سوئیٹر پہنایا گیا تھا کہ سردی اس پر اثر نہ کرے۔

طاہر کو خوشی ہوئی کہ اس کے مالک نے اس کا خیال کیا۔ کہیں پڑھا ہوا امام غزالی کا قول یاد آ گیا کہ ''مخلوق سے ایسا معاملہ کرو جیسا تم اپنے حق میں پسند کرتے ہو اور خالق سے ایسا معاملہ کرو جیسا تم اپنے غلام سے اپنے لیے کرانا چاہتے ہو''۔

اس دن باغ کے لیے جاتے ہوئے راستے میں اس نے سڑک کے کنارے ایک خاتون کو سڑک سے الٹی طرف منہ کیے بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ ذرا فربہ تھیں، ایک بڑی سی چادر میں منہ چھپایا ہوا تھا لہٰذا عمر کا اندازہ نہ ہوا وہ چائے پراٹھے والے ڈھابے سے ذرا ہی فاصلے پر بیٹھی تھیں لیکن وہ ہرگز فقیر نہ تھیں۔ باغ میں چہل قدمی کر کے واپس گھر آتے ہوئے وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ خاتون ابھی تک اسی طرح بیٹھی تھیں۔

ان سے پوچھنا تو چاہیے آخر وہ کیوں یہاں بیٹھی ہیں۔ طاہر یہ سوچ کر آگے بڑھا سلام دعا کے بعد بیٹھنے کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ وہ اپنے بیٹے کے انتظار میں بیٹھی ہیں جس نے اس بس اسٹاپ پر اترنے کے لیے کہا تھا۔ شہر کے دوسرے سرے سے اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے آنے والی یہ ادھیڑ عمر عورت تھیں۔ تھکن ان کے لہجے سے عیاں تھی۔ طاہر نے ناشتے کا پوچھا تو انہوں نے ہلکے سے سر ہلایا۔

طاہر نے چائے کے ہوٹل والے کو ناشتے اور چائے کے لیے ادائیگی کی اور ان کی طرف اشارہ کر کے پہنچانے کا کہا۔ مڑ کر واپس ان کی طرف آتے ہوئے اس نے اسی مجذوب کو دیکھا جس کے آگے سالن کی لبالب بھری پرات اور دوسری میں آٹھ دس روٹیوں کا پہاڑ رکھا تھا۔ پھر بھی ہوٹل کا چھوٹا لڑکا اس سے پوچھ رہا تھا ''بابا جی کچھ اور چاہیے؟''

طاہر نے واپس آ کر خاتون سے پوچھا کہ ان کے بیٹے نے بس اسٹاپ کا کیا نام بتایا تھا۔ طاہر کے شک کے مطابق اماں جی پہلے اتر گئی تھیں ان کے بیٹے کا بتایا ہوا اسٹاپ اس جگہ سے ذرا فاصلے پر تھا۔ طاہر نے کہا۔

''آپ ناشتہ کریں میں آپ کے بیٹے کو دیکھتا ہوں''۔ پھر پلٹا۔

''ارے ہاں آپ کے بیٹے کا کیا نام ہے؟''

خاتون نے بیٹے کے نام کے ساتھ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی بتایا کہ وہ کالا شلوار قمیض پہنے ہوگا۔

اگلے ہی موڑ پر بس اسٹاپ کے نزدیک طاہر کو ایک پریشان سا نوجوان کالے کپڑوں میں دور سے ہی نظر آ گیا۔ نام پوچھا تو وہ ان ہی خاتون کا بیٹا نکلا۔

''تمہاری ماں ہوٹل کے پاس تمہارا انتظار کر رہی ہیں''۔ طاہر نے اشارے سے بتایا۔

طاہر کی بات سن کر نوجوان کی آنکھیں مارے تشکر کے جھلملا گئیں۔ اس نے طاہر کی بات سن کر تیزی سے اس طرف دوڑ لگا دی۔

طاہر بھی آہستہ روی سے ذرا اس طرف چلا تا کہ ماں بیٹے کے ملنے کا منظر دیکھ سکے۔

بیٹا ماں کو سہارا دے کر اٹھا رہا تھا۔ طاہر نے دور سے دیکھ لیا۔

اب اس کو گھر جانا تھا۔

واپس آتے ہوئے اس نے خود میں بہت مسرت اور اطمینان کی کیفیت محسوس کی۔ وہ سوچنے لگا مجھے کیا خبر تھی میری صحت مندی ان ہی مناظر سے خوشیاں کشید کرنے میں ہے اور ان راہ چلتے لوگوں کے چہروں پر خوشی لانے میں ہے۔ وہ آپ ہی آپ مسکرانے لگا۔ آج اسے محسوس ہی نہ ہوا کب واپسی کا راستہ ختم ہوا اور اب وہ اپنے گیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

فرحی نعیم

ہوشیار

حمنہ نے وردہ اور ارسلہ کو پہلے تو گھور گھور کر دیکھا اور اپنے لہجہ کو قابو میں رکھ کر انہیں خاموش ہونے کی تاکید کی لیکن، ان دونوں ڈھیٹوں نے بجائے خاموش ہونے کے اپنی بے سری آواز میں ایک نیا گیت گانا شروع کر دیا تھا۔ تب حمنہ نے صوفے سے کشن اٹھایا اور دونوں کو ایک ایک رسید کر دیا۔

''بجائے چپ ہونے کے تم دونوں نے مجھے جلانے کے لیے ایک اور گانا گانا شروع کر دیا''۔ حمنہ غصہ سے ہانپتے ہوئے بولی۔

''اُف آپی، آپ تو ہمیں خوش بھی نہیں ہونے دے رہیں''۔ ارسلہ نے خفگی سے بڑی بہن کو دیکھا۔

''تو اور کیا، اتنے عرصے بعد تو گھر میں خوشی کا موقع آیا ہے۔ آپ کی شادی ہوگی اور آپ ہیں کہ ہمیں خوشی کے گانے بھی نہیں گانے دے رہیں''۔ وردہ نے بھی منہ بنایا۔

''بس اب ایک لفظ بھی نہیں''۔ حمنہ نے منہ پر انگلی رکھ کر دانت پیسے۔

☆.....☆.....☆

قصہ کچھ یوں تھا کہ حمنہ نے تازہ تازہ بی۔ کام کا امتحان دیا تھا اور جس طرح سر منڈاتے ہی اولے پڑتے ہیں تو اسی طرح اس کے ساتھ ہوا۔ امتحان سے کیا فارغ ہوئیں لگتا تھا شہر والوں کو خبر ہوگئی کہ حمنہ بی بی کے گھر والے انہیں بیاہنے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔ یوں پچھلے ایک ماہ میں اس کے تین پیغام آ گئے تھے جن میں سے ایک رشتہ پرامی، بابا سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ تایا جان لڑکے کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہے تھے جو اطمینان بخش تھیں۔ گھر میں بات چیت، مشورے چل رہے تھے۔ پھوپھی جان بھی آجاتیں تو امی ان سے بھی رائے اور مشورے لیتیں، سب سر جوڑے بیٹھ جاتے۔ ارسلہ اور وردہ نے گھر میں ایسی صورتحال دیکھی تو حمنہ سے چھیڑ چھاڑ کرنی شروع کر دی اور پھر تیمور کے رشتے پر ''ہاں'' کیا ہوئی دونوں لڑکیوں کو موقع ہی مل گیا۔ صبح، شام وہ تانیں لگاتی رہتیں۔ ہما آپا اور شائلہ باجی، ان دونوں کے چکر بھی میکے میں لگنے شروع ہو چکے تھے۔ ان دونوں کے بچے بھی جب چھوٹی خالاؤں کو اوٹ پٹانگ گاتے دیکھتے تو خود بھی سُر سے سُر ملانے لگتے تو، پھر تو جو حالت ہوتی مانو الامان الحفیظ، ایسے میں حمنہ تو اوپر سے نیچے تک سلگ جاتی اور اب تو منگنی کی بھی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ جس کی وجہ سے گھر میں ہمہ وقت رونقیں چھا گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

حمنہ کو افسوس، تیمور کے رشتے یا شادی پر نہیں، بلکہ اپنے ان پروگراموں کے ملیا میٹ ہونے پر تھا جو امتحانوں سے قبل ان سب سہیلیوں نے بنائے تھے کہ امتحانوں کے بعد پہلے تو خوب سو سو کر تھکن اتاریں گے، پھر ایک دوسرے کے گھروں میں ون ڈش پارٹی رکھیں گے، مختلف کورسز کریں گے، بلکہ ایک دو کا تو شوقیہ جاب کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ حمنہ نے بھی بڑے لمبے چوڑی منصوبہ بندی کی تھی لیکن اس کے خوابوں کا محل تو تعمیر ہوتے ہی ڈھے گیا تھا جس کی وجہ سے وہ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ اپنا غصہ اور تو کسی پر نہیں نکال سکی، لیکن دونوں چھوٹی بہن اور کزن ضرور اس کے عتاب کا شکار ہوگئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

حمنہ اور اس کے تایا کی فیملی ایک ہی گھر میں اوپر نیچے رہائش پذیر تھی۔ تایا جان کے تین بچے تھے۔ بڑا عذیر جس کی شادی ہو چکی تھی اور جو اپنی بیوی، بچی کے ساتھ والدین کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ پھر شائلہ باجی ان کی شادی کو بھی چھ سال ہو گئے تھے۔ دو بچوں کی والدہ محترمہ بھی بن چکی تھیں۔ پھر وردہ جو میٹرک کی طالبہ تھی۔ خود حمنہ بھی تین ہی بہنیں تھیں۔

بڑی ہما آپا، پھر حمنہ اور چھوٹی ارسلہ پرائمری کلاس کی طالبات تھی۔ عذیر کی شادی بھی چار سال پہلے ہوئی تھی اور اب حمنہ کی شادی کو وہ دونوں خوب انجوائے کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن ادھر حمنہ کو ان دونوں کی یہ شوخیاں ایک آنکھ نہ بھا رہی تھیں۔ وجہ وہی تو سارے پروگرام جو چوپٹ ہونے جا رہے تھے۔ دوسری طرف امی، بابا تھے جو حمنہ کی مناسب عمر میں اچھے رشتہ طے ہونے پر مطمئن اور خوش تھے۔

☆.....☆.....☆

منگنی کی تاریخ طے ہوتے ہی دونوں بڑی بہنیں شائلہ اور ہما نے بازاروں کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ بچوں کو میکہ میں چھوڑ کر وہ بازار چلی جاتیں۔ امی اور تائی بھی ان دونوں کے اس طرح ذمہ داریاں نبھانے پر مطمئن تھیں کیوں کہ وہ دونوں خود اب بازار کے رش اور دکانداروں کی چرب زبانی سے گھبراتی تھیں۔

ہما کے ساتھ کبھی حمنہ چلی جاتی تو کبھی شائلہ اور ہما، ارسلہ اور وردہ کو ساتھ لے کر خریداری کروا دیتیں۔ کئی سال بعد گھر میں شادی کی رونق لگی تھی تو سب ہی بڑے جوش خروش سے حصہ لے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

''یہ دیکھو! حمنہ، ہم نے تمہاری نندوں کے لیے کیسے قیمتی جوڑے خریدے''۔ ہما نے ہلکے اور گہرے رنگوں کے بڑے خوبصورت جوڑے حمنہ کے آگے رکھے۔ آج شائلہ اور ہما نے، حمنہ کے سسرال والوں کو منگنی میں دینے کا جو ''دین'' تھا اس کی خریداری کی تھی۔

''یہ گلابی والا بڑی نند کا، سبز منجھلی کا اور کاسنی چھوٹی والی کا''۔ شائلہ نے ساتھ وضاحت کی۔

''وہی چھوٹی جو سب سے زیادہ تیز لگتی ہے''۔ وہ کہتے کے ساتھ ہنسی۔

''لیکن مجھے تو نہیں لگتی''۔ حمنہ سادگی سے بولی۔

''لو جی یہ تو ابھی سے حمایتی بن گئیں''۔ ہما نے بھنویں اچکاتے ہوئے معنی خیزی سے نظریں اور گردن گھمائی۔

''ارے، تم کیا جانو، بھولی بانو، یہ سسرال والے کیا چیز ہوتے ہیں۔ ہم سے پوچھو''۔ شائل ایک سوٹ کا دوپٹہ پھیلاتے ہوئے بولی۔

''تو اور کیا''۔ ہما نے بھی تائید کی ''اوپر سے کچھ اور اندر سے کچھ، بالکل میٹھی چھری''۔ وہ طنزاً بولی۔

''ابھی سے ہم سے سسرال میں رہنے کی ٹپس لے لو، فائدہ میں رہو گی''۔ شائلہ ایسے بولی جیسے سسرال نہ ہوا ہاسٹل ہو گیا۔

''اری لڑکیوں یہ کیا تم انٹ شنٹ بول رہی ہو، خواہ مخواہ اس معصوم کو پریشان کر دیا''۔ تائی نے حمنہ کی اتری صورت دیکھ کر دونوں لڑکیوں کو ڈپٹا۔

''یہ انٹ شنٹ نہیں ہے امی، دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے''۔ شائلہ نے اپنی بچی کی فراک بیگ سے نکالتے ہوئے کہا اور حمنہ کو دکھائی ''یہ دیکھو حمنہ، کیسی ہے؟''

''جی اچھی ہے''۔ حمنہ نے اس پھولی پھولی فراک کو دیکھ کر کہا۔ لیکن اب اس کے ذہن میں اپنی چھوٹی نند زرین کی صورت گھوم رہی تھی۔ جب سے رشتہ کو ہاں ہوئی تھی وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ضرور آتی تھی اور حمنہ کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی۔

''حمنہ پارلر سے ٹائم لے لیا''۔ ہما پوچھ رہی تھیں۔

''آں.....جی.....لے لیا''۔ وہ چونک کر بولی۔

''شکر ہے یہ کام تم نے اپنی سہیلی کے ذریعے کر لیا''۔ ہما نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''مہندی کی بھی بات ہو گئی نا.....؟'' جواب میں حمنہ نے پھر اوپر نیچے سر ہلا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

منگنی کی تقریب بہت اچھی طرح ہو گئی تھی۔ چلتے چلتے حمنہ کی ساس نے اسے گلے سے لگاتے امی کو کہہ دیا تھا کہ وہ جلد رخصتی کروا لیں گی۔

ایک ماہ بعد ہی حمنہ کی ساس نے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کا عندیہ دے دیا تھا اور پھر دونوں گھرانوں میں صلح و مشورے کے بعد، عید کے بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ یوں تقریباً پانچ ماہ تھے شادی کی تیاری کے لیے۔ اب جہاں گھر میں شادی کی تیاری شروع ہوئی تو

دوسری طرف دونوں بڑی بہنوں نے سسرال میں رہنے، سسرالیوں کی بیان بازیوں سے نمٹنے، ان کی سازشوں، چالاکیوں سے آگاہ کرنے کا ایسا لگتا تھا کہ ذمہ ہی لے لیا ہو۔ حمنہ ٹھہری سدا کی سیدھی اور امن پسند وہ تو یہ سب سن سن کر سن ہی ہو جاتی۔

''دیکھو حمنہ تمہاری تین نندیں اور ایک جٹھانی بھی پہلے سے تمہارے استقبال کے لیے وہاں موجود ہیں۔ تمہاری جٹھانی تو مجھے اللہ معاف کرے بہت ہی تیز لگتی ہے۔ تم اس سے زیادہ گھلنا ملنا نہیں، دو نندیں تو شادی شدہ ہیں لیکن وہ جو چھوٹی ہے نا، اس کو بھی بتا دینا کہ تم اتنی آسانی سے دبنے والی نہیں، وہ تو تمہارے جاتے ہی ایسی بن جائے گی کہ جیسے اسے تو چائے بنانا یا انڈہ اُبالنا بھی نہیں آتا۔ لیکن تم ذرا ہوشیاری کا مظاہرہ کرنا''۔ شائلہ تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔

''ہاں مجھے بھی وہ گنوں کی پوری لگتی ہے، تیمور شاید اپنی چھوٹی بہن کو بہت چاہتا ہے، ذرا اسے کھینچ کر رکھنا''۔ اب ہما اسے مشورے دے رہی تھی۔

''ہاں یہ جو شوہر ہوتے ہیں نا، بڑے گُھنے ہوتے ہیں، شروع میں ہی لگامیں کھینچ لو گی تو ٹائٹ رہیں گے، ورنہ اپنی ماں بہنوں کے علاوہ انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا''۔ ہما اور شائلہ اُسے قبل از وقت ''ہدایات'' دے رہی تھیں اور حمنہ بے چارگی سے انہیں دیکھ اور سن رہی تھی۔

''ارے یہ تم دونوں اُسے کیسی پٹیاں پڑھا رہی ہو''۔ امی جو کسی کام سے کمرے میں آئیں تو ان تینوں کو دیکھا جو بیڈ شیٹ پیک کر رہی تھیں۔

''آپ نہیں جانتیں امی، یہ سسرال والے نئی بہو کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ آپ ٹھہریں سیدھی سادھی اور آپ کی یہ بیٹی بھی بالکل آپ پر گئی ہے''۔ ہما کے ہاتھ میں حمنہ کے جہیز کی ایک قمیض تھی جس پر وہ موتی ٹانک رہی تھی۔

''ارے بس، ہمارے اپنے گھر میں بھی بہو ہے، کیا عذیر کی دلہن کے ساتھ ہمارا تمہارا رویہ ایسا ہے؟'' امی ناراضگی سے پوچھ رہی تھیں۔

''چچی جان، ہم نے تو کبھی نندوں والا رویہ رکھا ہی نہیں، نہ کبھی امی نے روک ٹوک کی۔ ہم تو اُسے اپنی بہن ہی سمجھتے ہیں''۔ شائلہ نے جلدی سے صفائی دی۔

''تو حمنہ کے سسرال والے بھی اُسے بیٹی ہی بنا کر لے جائیں گے۔ ان شاء اللہ''۔ امی نے کہا اور کمرے میں جو سامان رکھنے آئی تھیں وہ رکھنے لگیں۔

جیسے جیسے حمنہ کی شادی قریب آتی گئی اس کے جہیز کی تیاری کے ساتھ اس کی ذہن سازی میں بھی تیزی آتی گئی۔ وہ دونوں نہ جانے اُسے سسرال میں رہنے کے لیے کیسی ٹریننگ دے رہی تھیں اور دینا چاہتی تھیں۔ حمنہ بے بسی سے منہ سے ان کو ہدایات، اور چھ، آٹھ سالہ تجربے کا نچوڑ سنتی رہتی۔ کچھ ان کے خلاف کہنے کی کوشش کرتی تو فوراً اُسے ''بھولی بانو'' کہہ کر چپ کرا دیا جاتا۔

''تم کیا جانو آج کل، لوگ کیسے چرب زبان اور دوغلے ہوتے ہیں۔ منہ پر کچھ اور پیچھے کچھ''۔ شائلہ نے آنکھیں دکھائیں۔

''اگر سسرالی اتنے ہی خطرناک ہوتے ہیں تو آپ لوگ میری شادی کیوں کر رہے ہیں؟'' آخر آج اس کی زبان پر وہ سوال آ ہی گیا تھا جو وہ پچھلے کئی دن سے ان سے کہنا چاہتی تھی۔

''اوہو اب شادی تو ضروری ہے نا، اب ہم تمہیں گھر تو نہیں بٹھا سکتے''۔ ہما نے لاپروائی سے کندھے جھٹکے اور حمنہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔ سارے خوش کن خیالات اور جذبات ان دونوں کی باتوں اور ڈراووں سے کہیں پرواز کر گئے تھے اور اب تو صرف آنے والے وقت اور نئے بننے والے رشتوں سے اندیشے وابستہ ہو گئے تھے۔

نہ جانے ساس کتنی سخت اور رعب داب والی ہوں گی.....! جٹھانی لڑاکا اور حاسد، شادی شدہ نندیں طنز کرنے اور لگائی بجھائی کا فریضہ انجام دیا کریں گی اور رہی کنواری نند، تو وہ اس کی ہر حرکت اور کام کی نگرانی کرے گی ساتھ نکتہ چینی اور مین میخ نکالنے کی ذمہ داری بھی نبھائے گی۔ سسرال نہ ہوا کانٹوں بھری وادی ہو گئی۔ جہاں قدم قدم پر روح و جسم زخمی ہونے کا خوف ہو۔ جب یہ رشتے اتنے ہی اذیت پسند اور دکھ دینے والے ہوتے ہیں تو والدین کیوں اپنی نازوں پلی، معصوم، کم عمر نازک کلیوں کو خوشی خوشی ان کے حوالے کر دیتے ہیں؟ یہ ایک پریشان کن سوال تھا۔ اور

وہ بھی لاکھوں لٹا کے.....؟ یہ دوسرا حیران کن سوال تھا۔

اور ان الجھا دینے والی سوچوں میں وہ اس ایک شخص کو تو بھول ہی گئی تھی جس کے خواب چند دن ہی اس کی معصوم آنکھوں میں سجے تھے۔ جس کا نام سن کر اس کا سادہ دل دھڑک اٹھتا تھا اور جس کی باتیں اس کے کومل جذبات کو چھیڑ دیتی تھیں۔ تیمور سے زیادہ تیمور سے منسلک رشتوں کی ہی ہر طرف باتیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

اور یہ شادی سے صرف ایک ہفتہ قبل کی بات تھی۔ آج اس کا نکاح تھا۔ مسجد میں نکاح کے بعد جب گھر کے مرد گھر آئے تو ایک شادمانی کی کیفیت ہر چہرے سے عیاں تھی۔ قریبی رشتہ دار خواتین گھر میں جمع تھیں۔ امی نے کھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب مہمان چلے گئے تو حسب معمول ہما اور شائلہ، حمنہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ارسلہ اور وردہ بھی ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ آج تو پھوپھی جان کی نا عمہ بھی تھی۔ ہما اور شائلہ اس وقت بھی اُسے سسرالی رشتوں کے ساتھ رہنے کے ''گُر'' بتا رہی تھیں۔

''اور بات سنو حمنہ! بچوں کو بھی زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں، ورنہ دیکھنا ہر وقت تمہارے کمرے میں گھسے رہیں گے، ایک دفعہ سختی سے منع کر دو گی نا تو آئندہ خود ہی سنبھل جائیں گے''۔ یہ کہنے والی نا عمہ تھی۔ ''میرے خیال سے جیٹھ اور نندوں کے بچے کل ملا کر سات آٹھ تو ہوں گے''۔

''ہاں، ہاں چھوٹے بڑے، ہر عمر کے بچے ہیں۔ یہ تم نے اچھا کیا اس کو خبردار کر دیا''۔ شائلہ نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

''لیکن بچے کیا کر لیں گے؟'' حمنہ تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

''یہ ہمیشہ گاؤدی ہی رہے گی''۔ نا عمہ افسوس سے بولی تھی۔

''ارے ہاں! اس کو ہم کب سے سمجھا رہے ہیں لیکن لگتا ہے سب اوپر سے گزر جاتا ہے۔ سسرال میں دب کر رہو گی تو سمجھو ساری عمر مسکینی کی زندگی گزرے گی''۔ یہ ہما تھی، جو خود تو نہ جانے کسی طرح رہتی تھی لیکن بہن کے لیے اس کی پٹاری میں بہت کچھ تھا۔

''اور تم دونوں نے اس کو میاں کو قابو میں کرنے کے بارے میں بھی بتایا، جس طرح تم دونوں نے شوہروں کی ناانصافیاں سہیں اس کو بھی ویسا بنا دو گی؟'' نا عمہ ان دونوں کو بھی مظلوم ثابت کر رہی تھی۔

''ہاں یہ تو تم ہی بتاؤ''۔ شائلہ جلدی سے بولی۔

حمنہ، میاں کو شروع میں ہی مٹھی میں کرنے کی کوشش کرنا''۔ نا عمہ نے اپنے قاعدے سے اب سبق پڑھانے شروع کیے تھے۔ ''ماں، بہنوں کے ساتھ تو انہوں نے بہت سال گزار لیے اب یہ وقت تمہارا ہے، گھومنا پھرنا، ہوٹلنگ، آؤٹنگ، ہنی مون یہ بہت ضروری ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں ہنی مون کا وعدہ لے لینا، ورنہ یہ شوہر اپنے وعدے سے پھرنے میں دیر نہیں لگاتے، کوشش کرنا ملک سے باہر چلی جاؤ، ورنہ اپنا ملک بھی برا نہیں، کم از کم پندرہ دن کے لیے، یہی تو دن ہوتے ہیں پھر تنہائی بھی ملے گی تو فرمائش بھی خوب کرنا اور ہاں شاپنگ کرنے میں کنجوسی نہ کرنا''۔

نا عمہ نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی اور حمنہ بڑے ضبط سے اُسے سن رہی تھی۔ نہ جانے ابھی اور کتنے اسباق تھے، لگتا تھا سارے ہی آج پڑھا دینے بلکہ حفظ کروا دینے تھے کہ اس کے بچوں کے لڑنے کی آواز نے اُسے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا اور حمنہ نے شکر کا سانس لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہیں کرو گی اور اپنے حسن سلوک سے میرا ہی نہیں بلکہ میرے گھر والوں کا بھی دل جیت لو گی''۔

تیمور، محبت سے حمنہ کا ہاتھ تھامے، شادی کی اولین صبح کو اس سے بڑے پیار سے گھر کو جوڑنے کا وعدہ لے رہے تھے۔ اور حمنہ جھکی نظروں، شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ تیمور کو یقین دہانی کروا رہی تھی۔ ''میری امی، بہنیں بہت محبت کرنے والی ہیں، ہاں بھابھی تھوڑی تنک مزاج ہیں۔ لیکن محبت بھرا رویہ تو سب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، تم میرے مان کو برقرار رکھنا''۔ تیمور نے حمنہ سے ایک اور وعدہ لیا تھا۔

''میری پوری کوشش ہو گی آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے اور آپ کا مان نہ ٹوٹے''۔ حمنہ نے دھیرے سے کہا اور تیمور کے چہرے پر آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆.....☆.....☆

''حمنہ، شادی کو چھ ماہ ہو رہے ہیں اور تم لوگ اب تک کہیں ہنی مون منانے نہیں گئے؟'' ہما نے چائے پیتے ہوئے بہن سے پوچھا۔ دونوں میکے آئی ہوئی تھیں۔

''آپا، ابھی ان کو آفس سے چھٹی نہیں مل رہی، جب چھٹی ملے گی تو چلے جائیں گے''۔ وہ سادگی سے بولی۔

''بے وقوف لڑکی، تیمور تم کو ٹال رہا ہے، تم تو ہو ہی سدا کی بدھو، اس نے بہانہ بنایا تم مان گئیں۔ بس تم اس سے کہو کہ فوراً لے کر چلے، ورنہ جیسے ہم نہ گئے ایسے ہی تم.....''

''آپا ہنی مون اتنا ضروری بھی نہیں ہوتا، اور تیمور نے کہا تو ہے، اب کیا اتنی ذرا سی بات کے لیے میں ان سے ضد کروں؟'' حمنہ نے بہن کی بات کاٹ کر آرام سے کہا تو ہما اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''تمہاری نندیں وغیرہ، سب ٹھیک چل رہی ہیں.....اور ساس؟''

''سب بہت اچھے ہیں، چھوٹی زرین بھی بہت معصوم اور محبت کرنے والی ہے''۔ حمنہ مسکرائی۔

''میرے خیال سے تم اب تیمور سے الگ کچن کی بات کر لو..... دیکھو تمہاری جٹھانی، کچھ عرصہ بعد تمہارا وہاں رہنا مشکل ہی نہ کر دے، مجھے اس کے تیور کچھ.....''

''آپا پلیز .....'' حمنہ کے چہرے پر ناگواری واضح ہوئی تھی۔

''آپ سب کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکیں۔ شادی سے پہلے آپ، شائلہ باجی اور ناعمہ باجی، نے کیسی کیسی تجاویز نہ دیں۔ سسرال والوں کو قابو کرنے کے عجیب عجیب مشورے''۔

''وہ تو ہم تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہے تھے تاکہ تم خوش.....'' یہ کہنے والی شائلہ تھی جو چند منٹ پہلے کمرے میں آئی تھی۔

''معاف کیجیے گا شائلہ باجی، جس قسم کی ہدایات آپ تینوں مجھے دے رہی تھیں اس سے میں خوش نہیں بلکہ.....'' اس نے چند لمحوں کا توقف کیا۔

''آپ لوگ مجھے گھر بنانے کے نہیں بلکہ گھر بگاڑنے کے مشورے ضرور دے رہی تھیں۔ آپ تینوں کی باتیں دلوں کو جوڑنے والی نہیں بلکہ دلوں کو توڑنے اور ایک دوسرے سے دور کرنے والی تھیں''۔ وہ بڑی ہمت سے کہہ رہی تھی اور وہ دونوں حیرت سے منہ کھولے اُسے دیکھ اور سن رہی تھیں۔

''وہ تو اچھا ہوا میری ایک سہیلی نے مجھے چند مشورے دیے۔ لیکن وہ مشورے آپ تینوں کے بتائے ہوئے مشوروں سے بالکل مختلف تھے اور اتنی سمجھ بوجھ تو مجھے بھی تھی''۔ حمنہ نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''سسرال ہمیشہ اتنا خوفناک نہیں ہوتا، جتنا خوفناک نقشہ آپ نے کھینچا تھا۔ جہاں پیار، محبت، خلوص ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ الحمدللہ میرے سسرال والے ہرگز ویسے نہیں جیسے آپ کہہ رہی تھیں۔ وہ لوگ تو مجھ پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں نے پہلے دن سے ہی ان کی خوشی اور مرضی کو فوقیت دی، ان کی رضا کو اپنی رضا بنایا اور شکر ہے مجھے اس کا صلہ بھی بہت اچھا مل رہا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ آپ لوگ مجھے.....'' وہ کچھ کہتے کہتے ہچکچائی۔ ''آپ لوگ مجھے منفی انداز میں سوچنا سکھا رہی تھیں۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ابھی اس گھر میں دو معصوم لڑکیاں اور ہیں۔ ابھی ان کے گھر بھی بسنے ہیں۔ خدارا یہ مفید مشورے ان کو مت دیجیے گا''۔ اس نے التجائیہ لہجہ میں کہا تھا۔

''یہ رشتے صرف محبت سے بنتے ہیں، یہ ہمیشہ خار کی طرح نہیں چبھتے بلکہ پھولوں کی طرح نرم اور خوشبودار بھی ہوتے ہیں''۔

اتنا کہہ کر حمنہ، نظریں جھکا کر خاموش ہو گئی تھی۔ ہما اور شائلہ بُت بنے اُس کو حیرانی سے سن رہی تھیں۔ یہ پہلی دفعہ تھا جب حمنہ بغیر رکے تسلسل سے بولی تھی لیکن یہ ضروری بھی تھا۔

حمنہ تو خاموش ہو گئی تھی لیکن دوسری طرف ہما اور شائلہ یہ سوچ رہی تھیں، کیا یہ وہی حمنہ ہے؟ شادی کے ان چند مہینوں نے تو اُسے بہت ''ہوشیار'' بنا دیا ہے!

☆.....☆.....☆

مدیحہ الرحمان

فصل گل کی نمو

الوہی مسکراہٹ نے اُس کے لبوں کا احاطہ کیا ہوا تھا جبکہ آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی لگائے ہوئے تھیں۔دھوپ چھاؤں کے امتزاج جیسے اس حسین منظر کو رملہ نے حیرانگی سے دیکھا اور پھر دھپ سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''آپی کیا ہوا؟ آپ بیک وقت رو بھی رہی ہیں اور مسکرا بھی رہی ہیں''۔جواباً وہ کچھ نہ بولی ہاں البتہ آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی اور مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔اچانک رملہ کی نظر اس کی گود میں پڑے اخبار پہ پڑی جسے اُس نے لپک کر اُٹھایا اور کچھ ہی دیر بعد وہ بھی بھیگی آنکھیں لیے فاطمہ کے گلے لگ گئی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا بھی احاطہ کرلیا۔

☆☆☆

''سچ اماں بہت مزا آیا آج سکول میں۔نرسری، پریپ کے چھوٹے چھوٹے بچے اتنے پیارے لگ رہے تھے اور ان کے معصوم سوال اور حرکتیں.....افففف.....اس نے آنکھیں میچ کر جیسے لطف اٹھایا اور اماں مسلسل مسکراتے ہوئے اسے دیکھے گئیں۔اچانک اس نے آنکھیں کھول کر اماں سے پوچھا۔

آپ کو پتہ ہے آج کیا ہوا سکول میں؟ دبا دبا جوش چہرے پہ لیے وہ اماں سے پوچھنے لگی۔جواباً اماں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ اسی جوش سے گویا ہوئی۔

''آج میں نے پہلی جماعت کے بچوں کو ڈرانے کی غرض سے کہا کہ کل کمرہ جماعت میں چھڑی ہونی چاہیے جو بچہ تنگ کرے گا یا کام نہیں کر کے آئے گا اس کی پٹائی ہوگی۔سب بچے خاموشی سے بیٹھے یہ سن رہے تھے کہ اتنے میں پچھلی قطار سے ایک بچہ اٹھ کر آیا اور بولا مس میں جاؤں؟ میں نے حیرت سے پوچھا کدھر ؟جواب آیا چھڑی لینے.....!''بات کے اختتام پہ دونوں ماں بیٹی کھلکھلا کے ہنسیں.....اور ان کی ہنسی پہ رملہ نے ناگواری سے ان کو دیکھا کہ کل اس کا ٹیسٹ تھا اور فاطمہ ذوق وشوق سے سکول کے قصے سناتی اس کی پڑھائی میں خلل کا باعث بن رہی تھی۔

شہر بانو بیگم رملہ کی ناگواری بھانپتے ہوئے فاطمہ سے مخاطب ہوئیں۔

''فاطی کل بہن کا ٹیسٹ ہے اسے پڑھنے دو بیٹا اور اور تم بھی تازہ دم ہو جاؤ میں ذرا ہانڈی بھون لوں پھر کھانا لگاتی ہوں''۔

عبداللہ صاحب اور شہر بانو بیگم آپس میں چچا زاد تو تھے ہی قدرت نے انہیں رشتہ ازدواج میں بھی منسلک کر دیا اور فاطمہ اور رملہ کی صورت میں اپنی رحمتوں سے بھی نوازا۔عبداللہ صاحب کو قدرت نے بیٹا نہیں دیا تھا لیکن اس کا قلق اُن دونوں میاں بیوی کو نہ تھا کہ وہ رب کی رضا پہ راضی رہنے والا سلیم الفطرت جوڑا تھا۔دونوں نے اپنی بچیوں کی تربیت بہت اچھے خطوط پہ کی تھی۔فاطمہ گریجویشن کے بعد ایک قریبی سکول میں معلمی کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی جبکہ رملہ کالج میں زیرِ تعلیم تھی۔

فاطمہ کے پاس بچوں کے حوالے سے روز ہی کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ بتانے کو ہوتا تھا کچھ وہ فطری طور پہ خود بھی بچوں سے بے حد لگاؤ رکھتی تھی اور معصوم فطرت سادہ سی پُرخلوص لڑکی تھی۔

سال گزرتے تعلیمی سیشن ختم ہوتے وقت کے گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا اور نئی کلاسز شروع ہوگئیں۔

''ابو جی میں نے اب کی بار ذرا بڑی کلاس لی ہے،ساتویں جماعت!''فاطمہ نے سکول سے واپسی پہ ابو کو بتایا۔

''برابر تعداد ہے سات بچے اور سات ہی بچیاں''۔اس نے

بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے ان کو کہا ہے کہ وہ بڑے ہو کر مجاہد بنیں آرمی میں جائیں''۔

نم آنکھیں لیے وہ جوش سے بتا رہی تھی اور ابو اس کی بات سن کر فقط مسکرا کر رہ گئے کہ وہ جانتے تھے فاطمہ کو اپنے مجاہدین، پاک فوج سے عشق تھا اور وہ اکثر آزردہ ہو کر کہا کرتی کہ ''میرا بھائی ہوتا تو مجاہد بنتا''۔اب اسے اپنے ان سٹوڈنٹس کی صورت میں اپنی خواہش کی تکمیل کی راہ نظر آ رہی تھی۔

فاطمہ وقتاً فوقتاً اپنی کلاس میں شہدا اور غازیوں کے قصے سناتی رہتی اور ان کو ترغیب دیتی کہ وہ بھی مجاہد بن کر شہادت جیسے عظیم رتبے تک پہنچنے کی کوشش کریں۔وقت پر لگا کر اڑ گیا اور آج اس کی کلاس کا سکول میں آخری دن تھا سالانہ امتحانات ہو چکے تھے۔تمام بچے افسردہ تھے فاطمہ بھی بار بار آنکھوں میں آئی نمی پیچھے دھکیل رہی تھی۔الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا تو اس کی کلاس کا ہونہار طالب علم سعد آگے بڑھا اور ایک عزم سے بولا۔

''مس میں آرمی میں ضرور جاؤں گا اور اگر میں شہید ہوا تو آپ کا حصہ بھی ہوگا میری شہادت میں کہ آپ نے ہی ہمیں شعور دیا اور جہاد کی اہمیت بتائی''۔نم آنکھوں میں محبت اور حیرت کا جہاں بسائے فاطمہ نے بے ساختہ سعد کی پیشانی چوم ڈالی۔اور بالآخر جانے والے چلے گئے اور زندگی پھر پرانے ڈھب پہ رواں ہوگئی۔بس طالبعلم نئے آتے گئے باقی وہی روز و شب کلاسز، امتحانات، وغیرہ۔

سردی، گرمی، خزاں، بہار ہر موسم اپنی چھب دکھا کر تیزی سے گزرتا گیا۔ننھے پودوں نے تناور درختوں کا روپ دھار لیا، بوڑھا برگد کا پیڑ کھوکھلا ہو گیا اور فاطمہ نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُسی سکول میں مستقل نوکری اختیار کر لی کہ بچوں کے درمیان اُسے بہت سکون ملنے لگا تھا۔بہت سی اچھی نوکریوں کی پیشکش کے باوجود وہ اپنے اس پہلے سکول کو نہ چھوڑ پائی کہ ان در و دیوار سے اسے انسیت ہو گئی تھی۔اسی دوران فاطمہ کی شادی بھی ہوگئی اور اللہ کا کرنا کہ شادی کے بعد بھی اس کو سکول آنے جانے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا کہ سسرالی گھر قریب ہی تھا۔

رملہ میڈیکل کے آخری سال میں تھی اور عبداللہ صاحب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے تھے زندگی ایک سُبک خرام ندی کی مانند رواں دواں تھی۔

لیکن فاطمہ اپنی اس پہلی کلاس کو کبھی نہ بھول پائی جن کے اندر اس نے وطن کی محبت اور شہادت کا بیج شدت سے بویا تھا۔وہ بھی اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے فاطمہ کو آگاہ کرتے رہتے۔ایسا ہی ایک سرد دن تھا فاطمہ سردیوں کی نرم دھوپ میں بیٹھی بچوں کو صبر کی اہمیت پہ درس دے رہی تھی کہ چوکیدار نے آ کر اطلاع دی۔

''مس جی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے''۔

''مجھ سے ملنے کون آ گیا؟'' یہ سوچتے ہوئے اس نے چوکیدار کو کہا۔

''آپ کلرک آفس میں بٹھائیں میں آ رہی ہوں''۔خان بابا سر ہلاتے ہوئے پلٹ گئے اور فاطمہ کلرک آفس کی جانب بڑھ گئی۔وہاں پہنچ کر اسے زبردست سرپرائز ملا اس نے بے ساختہ پلٹ کر خان بابا کو دیکھا، وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

''باجی مجھے منع کیا تھا بیٹے نے''۔

فاطمہ کے سامنے چھ فٹ سے نکلتا قد لیے فوجی یونیفارم میں ملبوس، آنکھوں میں عہد کی تکمیل کی چمک اور ہونٹوں پہ دھیمی مسکراہٹ لیے سعد کھڑا تھا۔ایک خوبصورت گلاب کی مانند کھلا ہوا!

کچھ دیر تو فاطمہ بول ہی نہ پائی بس ڈبڈبائی آنکھوں سے سامنے کھڑے شاندار افسر کو دیکھتی رہی جس کی استانی ہونے کا اسے فخر حاصل تھا اور جو اس کے ہاتھ کا لگایا پودا تھا۔

خاموشی کے اس وقفے کو سعد نے اپنی گھمبیر آواز سے توڑا۔

''مس میں اپنے عہد کی تکمیل کے بعد اپنے رب کے آگے بھی سرخرو ہوا ہوں اور آپ کے آگے بھی۔آپ ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھیں ناں ہمیں''۔اپنی بات کے اختتام پہ وہ مسکرایا۔

فاطمہ نے بمشکل تمام خود کو ٹرانس کی کیفیت سے نکالا۔ سعد کو بہت سی دعائیں دیں، اس سے حالات پوچھے سب کہ کیسے اور کتنی کٹھنائیوں کے بعد وہ اس مقام تک پہنچا اور جاتے سمے سعد نے اسے پھر رُلا دیا یہ کہہ کر کہ ''مس شہادت کی دعا کیجیے گا میں مرنا نہیں چاہتا ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہوں اور آپ ہی تو کہتی تھیں کہ شہید زندہ ہوتے ہیں مردہ نہیں''۔

فاطمہ نے محبت سے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''سعد یہ میں نہیں کہتی یہ ہمارا قرآن پاک کہتا ہے، ہمارا رب کہتا ہے''۔ آنسو چھلک ہی پڑے اور سعد کی پیشانی پہ الوداعی بوسہ دیتے ہوئے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کر کے فاطمہ کُھل کر روئی۔ جانے کیوں؟

گھر آ کر اس نے اپنے شوہر علی کو سعد کی بابت بتایا اور پھر مارے خوشی کے فوراً بابا کو کال ملائی۔ ان کو سعد کے بارے میں تفصیل بتا کر وہ بہت مگن اور خوش سی تھی۔

وقت کی رفتار تو بہتے پانی سے بھی تیز ہوتی ہے کہ تیزی سے بہتے پانی کی راہ میں کوئی رکاوٹ آ جائے تو لحظہ بھر کو اسے روک دیتی ہے لیکن وقت کی راہ میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں حائل ہو سکی۔

بوڑھے برگد کے ٹنڈ منڈ درخت کو جب سکول سے اکھیڑا گیا تو جانے کیوں فاطمہ کے اندر نمی اتر گئی۔ وہ ایسی ہی تھی بہت جذباتی بہت حساس سی۔

سعد سے ملاقات کے کچھ عرصے بعد اللہ پاک نے فاطمہ کو گل گوتھنے سے بیٹے سے نوازا اور ننھا احمر جب پاؤں پاؤں چلنے لگا تو سعد ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔ وہ بتانے آیا تھا کہ دعا کیجیے گا میں بارڈر پہ جا رہا ہوں کوئی علم نہیں کب تک وہاں ڈیوٹی رہے۔

کون جانتا تھا کہ یہ اس کی آخری ملاقات ثابت ہو گی۔

آج چھٹی کا دن تھا وہ بڑے دن بعد میکے آئی تھی، احمر کو نہلا دھلا کر وہ اور علی جلدی سے اماں کے گھر پہنچے تا کہ زیادہ سے زیادہ وقت وہاں بِتا سکیں۔ سب سے ملنے کے بعد علی تو بابا کے ساتھ باہر چلے گئے اور وہ اخبار لیے باہر لان میں آ بیٹھی کہ رملہ اور امی اسے کوئی کام نہ کرنے دے رہی تھیں جبکہ خود کچن میں مصروف تھیں دونوں۔

شہہ سرخی بہت نمایاں تھی۔ بارڈر پہ دشمن کو منہ توڑ جواب دیتے ہوئے پاک فوج کے افسر سعد احمد اپنے چار ساتھیوں سمیت شہید۔

تفصیل پڑھنے کی نہ اس نے زحمت کی نہ اسے ضرورت تھی۔ رملہ اسی دوران اسے پکارتی ہوئی باہر آئی تھی اور اس کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ امی نے اندر سے جھانک کر دیکھا تو دونوں بہنوں کو لپٹ کر ہچکیاں لیتے ہوئے پایا۔

''کیا ہوا ہے؟ سب خیر ہے ناں؟'' ان کا دل ڈوب رہا تھا۔

رملہ خود کو فاطمہ سے الگ کرتے ہوئے بولی۔

''امی آپی کا سٹوڈنٹ..... آپی کا بیٹا شہید ہو گیا ہے..... خوشی کے آنسو ہیں شہادت پہ''۔

اس نے اخبار آگے کر دیا۔ امی نے خبر پڑھ کر فاطمہ کو گلے لگایا جواب بہتی آنکھوں میں چمک لیے پُرسوچ نظروں سے احمر کو دیکھ رہی تھی۔ علی اور بابا جانے کب باہر سے آ گئے تھے اور اب خاموشی سے پیچھے کھڑے یہ جذباتی مناظر دیکھ رہے تھے۔

علی نے کھیلتے ہوئے احمر کو فاطمہ کی گود میں دے دیا۔

''فصل گل کی نمو جو آپ کرتی ہیں، یہ گل بھی آپ کا ہے اور اللہ نے چاہا تو یہ بھی ہمیشہ کی زندگی پائے گا''۔

علی کی بات کا مفہوم سمجھ کر سبھی نم آنکھوں سے مسکرا دیے تھے اور ننھے احمر نے کھلکھلا کر جیسے اپنی تائید کا اظہار کیا تھا۔

☆☆☆

سیر وسیاحت
پہلی قسط

آمنہ راحت ۔ برطانیہ

ماضی کے دریچوں سے

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ میں جلدی جلدی اپنا لیپ ٹاپ اور نوٹ بک آفس کے لاکر میں رکھ کر اپنی کولیگ شکیلہ کے پاس گئی۔ عموماً میں چھ بجے دفتر سے گھر کے لیے روانہ ہوتی تھی مگر چونکہ اگلے روز میری شادی کی دسویں سالگرہ تھی اور ہمارا اسکاٹ لینڈ جانے کا ارادہ تھا لہٰذا وقت سے پہلے ہی چھٹی لے چکی تھی۔ باہر آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور تیز ہوا کی سیٹیاں سنسنی خیز ماحول پیدا کر رہی تھیں۔ اسکاٹ لینڈ اور گردو نواح میں ڈینس طوفان آنے کی پیشگوئی تھی اور لوگوں کو گھروں کے اندر رہنے کی ہدایات دی جا رہی تھیں۔ ایسے میں جب میں نے شکیلہ کو اسکاٹ لینڈ جانے کے ارادے سے باخبر کیا تو وہ بے حد فکر مند ہوئی اور دعائیں پڑھنے اور احتیاط سے گاڑی چلانے کی ترغیب دینے لگی۔

اس کو الوداع کہہ کے میں نے آفس سے باہر قدم نکالا تو ہوا نے پوری قوت سے مجھے دائیں جانب دھکیل دیا۔ جب ہوا میرے قدم اکھیڑنے لگتی تو میں آس پاس کسی کھمبے یا دیوار کو مضبوطی سے پکڑ لیتی۔ آصف نے بچوں کے ہمراہ مجھے آفس سے لینے کے لیے آنا تھا مگر تاحد نگاہ مجھے کہیں اپنی گاڑی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے میں Walker morris کی بلند و بالا عمارت کے عقبی دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی آصف کو فون ملایا تو انہوں نے بتایا کہ وہ دفتر کے راستے میں آنے والے پل کے پاس ٹریفک جام میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں اور گاڑیاں کسی طور پر چلنے کا نام نہیں لے رہیں۔ آفس سے جلدی چھٹی کا مقصد یہی تھا کہ ہم بروقت اسکاٹ لینڈ پہنچ سکیں کیونکہ دفتر سے وہاں کا سفر کم از کم چار گھنٹے کا تھا۔

اس بار آصف نے سیر کی ساری پلاننگ خود کی تھی۔ یہاں تک کہ مجھے کسی ہوٹل کا نام تک نہیں پتہ تھا۔ دفتری مصروفیات کے باعث میں نے آدھا سامان خود پیک کر کے بقیہ اشیاء کی لسٹ بنا کر آصف کو دے دی تھی۔ آصف نے پہلی بار سامان خود سمیٹنا تھا اور ساری سیر کی منصوبہ بندی بھی ان کے ذمے تھی۔ مگر رش کے باعث جلدی نکلنے کا منصوبہ ہاتھوں سے سرک رہا تھا۔ میں نے ایک دوبار اور فون کیا مگر رش کی صورتحال میں بمشکل انیس بیس کا فرق پڑا تھا۔ جس پل کے پاس آصف موجود تھے وہ آفس سے دو منٹ کی مسافت پر تھا مگر گاڑیوں کے جم غفیر نے دو منٹ کی دوری کو آدھ گھنٹے میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس اثنا میں میں نے اپنی بہن کو فون ملایا اور ان سے کہا کہ ہم سیر کرنے اسکاٹ لینڈ جا رہے ہیں، موسم بہت خراب ہے دعا کرتی رہیں کہ سفر بخیریت گزرے۔ دروازے کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے میں پھر ہوا کے زوردار دھکوں سے قدرے محفوظ تھی مگر سامنے سے گزرنے والے لوگوں کو مستقل سہارا لیتے اور ہوا کے دوش میں بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ ساڑھے پانچ ہوئے تو آصف گاڑی لیے پہنچ گئے۔ جب گاڑی میں سوار ہوئی تو شدید ٹھنڈ کے باعث میں تقریباً کانپ رہی تھی۔ آصف نے ہیٹر چلایا۔ گاڑی کا رخ موڑا تو پھر اسی رش میں جا پھنسے۔ دفتر سے چھٹی کا وقت تھا اور سارا شہر ہی جیسے سڑکوں پر اُمڈ آیا تھا۔ گاڑیاں بمشکل انچ انچ سرک رہی تھیں۔ شہر سے باہر نکلتے نکلتے مزید 45 منٹ گزر گئے۔

آصف ہاتھ میں موبائل فون پکڑے راستے کے نقشے سے مستقل رہنمائی لیتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے گاڑی چلا رہے تھے۔ میں نے آصف کو کئی بار کہا کہ موبائل مجھے پکڑا دیں اور تسلی سے گاڑی چلائیں مگر انہوں نے مجھے ٹال دیا۔ اتنے میں آصف نے کہا کہ میں سڑک پر لگے علامتی نشانات کو دیکھوں اور اندازہ لگاؤں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ اب تک آصف مجھے نہ ہی ہوٹل کا نام پتہ اور نہ ہی شہر کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔ میں نے signboards کو پڑھنا شروع کیا تو M1 (south) اور پھر Sheffield لکھا نظر آیا۔ میں نے آصف سے متجسس انداز میں پوچھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ انہوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا اور میں سوچتی رہی کہ اگر ہم اسکاٹ لینڈ جا رہے ہیں تو شمال کے بجائے جنوب کی سمت میں

کیوں سفر کر رہے ہیں۔ اتنے میں انہوں نے گاڑی شیفیلڈ کے شاپنگ مال Meadow hall کی جانب جانے والی سڑک پر چڑھا دی۔ اکثر ہمارے درمیان اس مال کا ذکر ہوا کرتا تھا اور میں نے کبھی یہ جگہ دیکھی بھی نہ تھی۔ میرے ذہن میں ایک لمحے کو خیال دوڑا کہ کہیں آصف مجھے Meadow hall ہی نہ لے کر جا رہے ہوں، مگر آصف نے تردید کر دی اور ہم ایک بار پھر اگلی سڑک سے موٹروے پر چڑھ گئے۔

میرا ذہن مستقل تانے بانے بننے میں مصروف تھا کہ آصف نے بتایا کہ انہوں نے اسکاٹ لینڈ پر بہت غور کیا مگر چونکہ ہم تقریباً چار پانچ بار وہاں جا چکے ہیں تو شادی کی دسویں سالگرہ وہاں منانے کے بجائے انہوں نے لندن جانے کا ارادہ کیا ہے۔ میں نے کئی دنوں سے خود کو پہاڑوں وادیوں اور جھیلوں کے تصور میں مگن کر رکھا تھا، وہاں کی بل کھاتی سڑکوں اور حسین قدرتی مناظر سے نظروں کو خیرہ کرنے کے ان گنت خواب بنے تھے، آبشاروں کے جھرنوں سے چھنتی ہوئی سورج کی کرنوں اور کالی گھٹاؤں سے آنکھ مچولی کھیلنے کا پروگرام بنایا تھا، سب کے سب سپنے کرچیوں کی طرح زمین پر بکھرنے لگے۔ میری خوشی اور جوش زائل ہونے لگا۔ دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شادی کے دس سال منانے کے لیے آصف کو لندن ہی نظر آیا تھا۔ گرچہ لندن، انگلینڈ کا دارالحکومت تھا مگر اس کا اسکاٹ لینڈ کے قدرتی مناظر سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔

میں نے تھکے تھکے انداز میں آصف سے پوچھا کہ ہم لندن کے کس ہوٹل میں ٹھہریں گے اور کیا لندن eye دیکھنے جائیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ لندن کے باہر ہی ہوٹل آ جائے گا۔ فارعہ بھی پریشان ہو گئی اور رونے لگی کہ میں نے اسکاٹ لینڈ جانا تھا لندن نہیں۔ میں نے گاڑی میں حالات خراب ہوتے دیکھ کر دل کو مضبوط کیا، چہرے پر نقلی مسکراہٹ سجائی اور فارعہ کو تسلی دینے لگی۔ پھر آصف کو لندن میں موجود قابلِ دید مقامات کے بارے میں تفصیلات بتانے لگی۔ غرضیکہ میں خود کو ذہنی طور پر لندن کی سیر کے لیے آمادہ کر رہی تھی۔

اتنے میں ہمیں راستے میں قیام و طعام کا نشان نظر آیا۔ فارعہ لندن کے بارے میں جان کر اس قدر روئی کہ تھک ہار کر سو چکی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت تھا تو وہاں رک کر باتھ روم سے فارغ ہو کر کچھ کھانے کا ارادہ کیا۔ فارعہ جس کا پہلے ہی موڈ بہت خراب تھا، وہاں سے اپنے پسندیدہ کھلونے نہ ملنے کی وجہ سے مزید دلبرداشتہ ہو چکی تھی وہاں برگر کنگ سے فش برگر کھایا اور پھر سے گاڑی میں بیٹھ کر سفر شروع کیے ابھی دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ آخر کار آصف نے کہا:

''ہم لندن نہیں جا رہے بلکہ جبرالٹر جا رہے ہیں''۔

میں کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''آصف یہ حتمی جگہ ہے یا یہ بھی فائنل نہیں ہے؟''

میں جو لندن کے نام سے مایوسی کی گہرائیوں میں غوطے کھا رہی تھی، روح میں سرایت کرتی ہوئی ہلکی سی خوشی کو محسوس کرنے لگی۔ جبرالٹر قدیم ہسپانیہ کا حصہ ہے اور برطانیہ کے زیرِ حکومت ہے۔ میں نے آصف سے تفصیلات پوچھیں تو انہوں نے بتایا کہ وہاں کے ویزے کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوا اور ہوٹل بہت خوبصورت ہے اور ہم بذریعہ جہاز وہاں جائیں گے۔

میری آواز میں طاقت بحال ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو اسکاٹ لینڈ نہ سہی تو کم از کم لندن کے رش اور زمینی تفریح گاہیں بھی نہیں۔ جہاز کے سفر کا بھی اپنا ہی مزہ ہے اور جبرالٹر ویسے بھی ہسپانیہ کا حصہ ہے۔ فارعہ نے انتہائی ناراضگی میں جہاز پر جانے اور ائیر پورٹ جانے سے بھی انکار کر دیا۔ ہم نے فارعہ کو تسلی کرانے کے لیے کہا کہ ہم جبرالٹر میں کسی higlands پر چلے جائیں گے۔ میں نے آصف سے کہا کہ اب آپ مجھے فون پکڑا دیں تا کہ میں سمت نمائی کرنے میں آپ کی مدد کروں کیونکہ سرپرائز کھل چکا ہے۔ جب ہم نے Arrival time دیکھا تو 10 بج کر 17 منٹ تھا۔ آصف کے بقول فلائٹ کا وقت پونے بارہ تھا۔ ہمیں گاڑی تیز چلانے کی ضرورت تھی۔

ہم M11 پہنچے تو تعمیر و ترقی کی غرض سے موٹروے کا وہ حصہ جو ائیر پورٹ جانا تھا بند کیا گیا تھا۔ متبادل راستے سے جانے کی صورت میں پہنچنے کا وقت 10 بج کر 33 منٹ ہو جاتا تھا۔ پریشانی سے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ فلائٹ چھوٹ جانے کا اندیشہ حاوی ہو رہا تھا۔ مستقل

میں اللہ سے وقت میں برکت کی دعا مانگ رہی تھی۔ قیام وطعام میں ایک گھنٹہ سکون سے گزارنے پر پچھتا رہے تھے۔ لا محالہ ہمیں دوسرا راستہ اختیار کرنا تھا مگر وہ ہمیں ایک سنسان بیابان جنگل اور پراسرار بل کھاتے راستوں پر لے آیا جہاں ہمارے علاوہ نہ کوئی گاڑی تھی اور نہ ہی انسان جبکہ کچھ جانور اور گلہریاں درختوں اور جھاڑیوں میں سے آتے جاتے نظر آئی تھیں۔ ان سڑکوں پر واحد روشنی ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں ہر ایک دو میل کے بعد گاڑی مزید تنگ اور سنسان راستے پر جا نکلتی۔ جب چند میل کا سفر رہ گیا تو ہم اس شک میں مبتلا ہو گئے کہ واقعی ائیر پورٹ اس جنگل کے اتنے قریب ہے یا ہم غلط راستے پر جا نکلے ہیں۔ وقت کی شدید قلت کی وجہ سے ایک بھی غلط موڑ مڑنے کا رسک لینے کے ہم متحمل نہ ہو سکتے تھے اسی اثنا میں ہمیں ائیر پورٹ کے اشارے نظر آنے لگے۔ آصف نے گاڑی meet and greet پر کھڑی کرنی تھی۔ ہم سمت نما اور سڑکوں پر لگے سائن بورڈز کو دیکھتے ہوئے meet and greet کی استقبالیہ پر پہنچے تو مشین پر کئی بار بٹن دبانے کے باوجود رکاوٹ نہ ہٹی۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس وقت 10 بج کر 45 منٹ تھے کہ ایک ائیر پورٹ کا ملازم ہماری جانب چلتا نظر آیا۔ اس نے آصف سے ضروری دستاویزات اور پارکنگ کی تفصیلات والی ای میلز دیکھیں اور رکاوٹ ہٹا دی۔ جہاز اڑنے میں ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ باقی تھے۔ آصف نے گاڑی پارکنگ میں لگائی اور دفتر میں گاڑی کی چابی دینے کے لیے بھاگے۔ میں اور بچے سامان کے ہمراہ آصف کے پیچھے تیز تیز بھاگ رہے تھے۔ روانگی کو جانے والے راستے کے سامنے سامان کے ساتھ کھڑی میں آصف کی منتظر تھی۔

ان کے آتے ہی ہم برق رفتاری سے چیک ان کاؤنٹر کی جانب روانہ ہوئے۔ وہاں دیوار پر لگی سکرینوں پر مختلف ائیر لائنوں کے روانگی کے اوقات اور گیٹ نمبر آ رہے تھے۔ میں نے آصف سے پوچھا کہ ہم نے کس ائیر لائن سے جانا ہے تو انہوں نے جواباً pegasus کا نام لیا۔ میں ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی کہ آصف میری جانب مڑے اور کہنے لگے۔

infact i lied to you , we are going to ''Istanbul,Turkey'' میری تقریباً چیخ نکل گئی ''کیا واقعی؟''

مگر چونکہ دن بھر کی تھکان اس قدر شدید تھی کہ مزید جوش وخروش دکھانے کے لیے ہمت ختم ہو چکی تھی۔ میں نے پھر پوچھا'' آصف یہ حتمی جگہ ہے؟'' جس کی انہوں نے سر ہلا کر تصدیق کر دی۔

ہم Pegasus کے کاؤنٹر پر پہنچنے والے آخری مسافر تھے۔ وہاں کا عملہ سامان سمیٹ رہا تھا۔ ہمیں آتے دیکھ کر وہ رُک گئے۔ وہاں موجود ائیر لائن کے عملے نے ہماری سفری دستاویزات کا معائنہ کیا۔ آصف نے بورڈنگ کارڈ پہلے ہی بنوا لیا تھا جس کی وجہ سے کافی حد تک وقت کی بچت ہو گئی۔ اب جو ہم نے وہاں سے مسافر لاؤنج کی جانب چلنے کا ارادہ کیا تو ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ چلنا محال تھا اور ہم خود کو گھسیٹنے پر مجبور تھے۔ بیگ بک کروانے کے باوجود ایک بیگ اور ایک لفافہ اٹھائے جس میں بچوں کا ضروری سامان تھا، ہم ایک عظیم الشان دروازے کے سامنے جا پہنچے جدھر سے بذریعہ شٹل ہمیں روانگی کے گیٹ تک جانا تھا۔ شٹل سے اتر کر دو بار برقی سیڑھیوں کو عبور کیا اور بالآخر ہم اپنے گیٹ کے سامنے موجود تھے جہاں ترکی جانے والے مسافر کثیر تعداد میں کھڑے تھے۔

ترک خواتین اسکارف میں بھی تھیں اور مغربی لباس میں بھی۔ اور تو اور کئی یہودی بھی اس جہاز سے سفر کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے جو بذریعہ استنبول، اسرائیل جا رہے تھے۔ کالی ٹوپیاں اور کانوں کے دائیں بائیں جانب سے نکلتی دو پونی ٹیل ان کو سب سے نمایاں کر رہی تھیں۔ فارعہ کا موڈ بالآخر خوشگوار تھا۔ میں حیرانی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دائیں بائیں دیکھ رہی تھی اور خود کو اس حقیقت کا یقین دلا رہی تھی کہ میں واقعی استنبول جا رہی ہوں اور یہ کسی طور بھی خواب نہیں ہے۔

کچھ ہی دیر انتظار کرنے کے بعد گیٹ کھل گئے اور ہم ایک اور بس میں بیٹھ کر جہاز تک جا پہنچے۔ جہاز کے زینے چڑھنے اور سامان کیبن میں رکھنے کے بعد ہم سیٹوں پر ایسے بیٹھے جیسے صدیوں کے مسافر ہوں۔ میں بچوں کے درمیان والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ آصف نے برابر بیٹھے شخص سے گزارش کی اگر وہ ان کو ہماری قریبی نشست پر بیٹھنے دیں مگر انہوں نے معذرت کر لی۔ یہ کوئی 3 سے 3½ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ جب جہاز نے

اڑان بھری تو اس کے دس سے پندرہ منٹ بعد، آصف فارعہ کو گود میں لے کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ حمزہ سے نیند کوسوں دور تھی مگر فارعہ گود میں لیٹتے ہی سو گئی۔ میں بھی ہوا کے جھونکوں سے مستقل جنگ کرنے میں مشغول رہنے کے بعد کئی بار نیند کی وادیوں کی سیر کر چکی تھی۔ مگر جہاز میں تین گھنٹے کب گزرے اور کہاں گئے کچھ پتہ نہ چلا۔ تب ہوش آئی جب جہاز کی بلندی کم ہونا شروع ہوئی اور کان اتنی شدت سے بند ہوئے کہ درد سے میں اور فارعہ کراہ اٹھے۔ کبھی اس کے کان ملتی اور کبھی اپنے۔ خدا خدا کر کے جہاز بخیریت ترکی کی سرزمین پر اتر گیا۔

جہاز سے اترے تو وہاں ابھی گھپ اندھیرا تھا۔ کاؤنٹرز پر دستاویزات کی چھان بین جاری تھی۔ اپنی سفری دستاویزات پر مہر لگوا کر ہم نے سامان لیا۔ خوش قسمتی سے ہمارا بیگ سب سے پہلے نکل آیا کیونکہ ہم نے سب سے آخر میں سامان بک کروایا تھا۔ آصف نے وہاں سے کرنسی تبدیل کروائی اور ہم ائیر پورٹ سے باہر نکلنے لگے۔

اسی اثناء میں ایک ترک نے آصف کا راستہ روک کر ہماری منزل کا پتہ پوچھا ہوٹل کا نام بتانے پر اس نے 450 لیرا مانگے۔ ہم نے معذرت کی تو اس نے چیلنج کیا کہ اس سے کم ہمیں کہیں نہیں ملے گا۔ ہم ائیر پورٹ پر کھڑے پیلی گاڑیوں یعنی ٹیکسیوں کو دیکھتے تو وہ پہلے ہی مسافروں کو لیے یہ جا وہ جا ہو جاتیں۔ آخر کار ایک پیلی گاڑی ہمیں بھی مل گئی فون پر اس کو ہوٹل کا نام پتہ دکھایا تو اس نے ترک زبان میں کچھ کہہ کر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھے اور اس نے کم وبیش 10 منٹ بعد ہمیں ایک عمارت کے سامنے پہنچ کر میٹر کی طرف اشارہ کر دیا۔ 30 لیرا کی ادائیگی کے بعد ہم اپنی قیام گاہ Raddison Blue turla میں داخل ہوئے۔ آصف کاؤنٹر پر کھڑے شخص کے پاس چلے گئے جب کہ میں اور بچے سامان کے ہمراہ لابی میں کھڑے دیواروں پر لگی ویڈیوز دیکھتے رہے۔ آصف شاید بچوں کے بیڈ کے بارے میں مشاورت کر رہے تھے۔ بچے بے حد تھک چکے تھے اور آرام کرنے کے طلبگار تھے۔ بالآخر کمرے کا کارڈ حاصل کر کے ہم لفٹ کے ذریعے اوپر جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ سکیورٹی کے پیش نظر کارڈ کو دکھا کر لفٹ کا بٹن دبانا تھا۔ ہم اس بارے میں لاعلم تھے اور بٹن دبا کر کارڈ دکھائے بغیر لفٹ میں سوار ہو گئے۔ چنانچہ لفٹ چند سیکنڈ کے بعد بند ہو گئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا ہم چاروں ایک دم گھبرا گئے۔ آصف نے لفٹ میں لگے تقریباً سب بٹن دبا دیے۔ نہ لفٹ کھل رہی تھی، نہ چل رہی تھی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آصف نے موبائل کی روشنی جلا کر بٹن کی طرف کی تو میں نے الارم والا بٹن دبا دیا۔ دو سیکنڈ گزرے تو استقبالیہ پر موجود فرد کی آواز سنائی دی۔ آصف نے بتایا کہ ہم لفٹ میں پھنس گئے ہیں۔ اس نے آخر ہمیں باہر نکالا اور طریقہ کار بتایا۔ اب کی بار آصف نے کارڈ مشین پر دکھا کر لفٹ چلائی تو وہ خیر وعافیت سے پانچویں فلور پر پہنچ گئی۔

سامان اٹھائے کمرے میں پہنچے تو آرام دہ بستر اور کشادہ کمرہ ہمارا منتظر تھا۔ تھکاوٹ اس قدر تھی کہ سامان جہاں جگہ ملی رکھا، کپڑے تبدیل کیے، بچوں کو ٹوائلٹ سے فارغ کیا اور لیٹنے کا ارادہ کیا۔ آصف نے استقبالیہ پر بچوں کے لیے دو مزید بستروں کی درخواست کی تھی۔ اتنی دیر میں کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ترک خاتون دو بیڈ لیے لابی میں کھڑی تھی۔ وہ ترک زبان میں کچھ کہنے لگی اور ہم حیران وششدر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ہماری حالت دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ ہم اس زبان سے نا آشنا ہیں۔ چنانچہ اس نے مسکرا کر اشاروں کی زبان میں بات کرنی شروع کی اور ہم نے بھی اسی انداز میں باتوں کا جواب دیا۔ بڑی مشکل سے ہم نے اس کو بتایا کہ ہم بیڈ کہاں اور کس رخ میں رکھوانا چاہتے ہیں۔ جب کوئی کام ہماری مرضی کے مطابق ہو جاتا تو ہم انگوٹھے کے اشارے سے ''زبردست'' کا نشان بناتے اور وہ ہنس کر ''تمام تمام'' کہتی۔ تب ہم نے ترک لوگوں سے بات کرنے کے لیے ایک نیا لفظ سیکھ لیا۔ جو کام بھی ہوتا ہم بھی ''تمام تمام'' کہتے اور وہ بھی ہنس کے دہرا دیتی۔

اس کے جاتے ہی ہم نے بستروں کا رخ کیا۔ باہر سورج کی کرنیں کھڑکی میں سے جھانک رہی تھیں۔ مگر ہمارے سر اتنے چکرائے ہوئے تھے کہ کب سوئے کیسے سوئے کچھ یاد نہیں۔ میری آنکھ تب کھلی جب آصف مجھے جگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے نیند میں ادھ کھلی نظروں سے بائیں جانب دیکھا تو بچے گہری نیند میں نظر آئے۔ آصف

نے کئی بار آواز دی مگر میرے میں جنبش کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ پچھلے روز صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھی تھی اور 9 گھنٹے آفس میں گزارنے کے بعد چار گھنٹے گاڑی، چار گھنٹے جہاز اور کم وبیش 3 گھنٹے ائیر پورٹ پر گزارنے کے بعد پورا سفر 20 گھنٹوں پر محیط تھا۔ آصف نے زبردستی جگایا تا کہ آج کا دن نیند میں ہی نہ گزر جائے اور اس کا اچھا استعمال کیا جائے۔ میں نے بچوں کو جگایا جو بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ اندھیرا ہونے میں 5 گھنٹے باقی تھے۔ آصف کی خواہش تھی کہ آج ہم Blue Mosque جائیں جو ہمارے ہوٹل سے تقریباً 45 منٹ کی مسافت پر تھی۔

بچوں کے ہمراہ ہم نیچے استقبالیہ پر پہنچے تو وہاں کے اسٹاف نے ہمارے لیے ٹیکسی کا انتظام کر دیا جو چند منٹ میں آ گئی۔ آصف نے ان بزرگ ٹیکسی ڈرائیور کو موبائل فون پر Blue Mosque کا پتہ دکھایا۔ اس نے ترک زبان میں کچھ کہا اور ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ وہاں جیسے سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ارد گرد بلند و بالا عمارتیں اور لوگوں کے گھر نظر آ رہے تھے۔ اب راستے میں سامنے ایک سرنگ تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اشاروں کی مدد سے سمجھایا کہ اب ہماری گاڑی اس سرنگ سے گزرے گی۔ انگلینڈ میں بھی کئی tunnels دیکھی تھیں مگر یہ اتنی طویل تھی کہ جس کی ابتدا تو تھی مگر انتہا کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہ تھا۔ ہم سب اس انوکھے تجربے سے محظوظ ہوتے رہے۔ خدا خدا کر کے سورج کی کرنیں نظر آئیں تو آنکھیں اندھیرے کی اس قدر عادی ہو چکی تھیں کہ چندھیانے لگیں۔ کچھ ہی منٹ گزرے تو بائیں جانب نیلگوں پانی کی لہریں نظر آئیں۔ بزرگ ڈرائیور وقتاً فوقتاً ترک زبان میں کچھ بتا رہے تھے اور آصف میری جانب دیکھ کر استفہامیہ انداز میں پوچھتے کہ تمہیں کچھ سمجھ آئی ہے؟ کیا خبر وہ مستقل ہم سے کسی چیز کے بارے میں سوال کر رہے ہوں۔ ہماری جانب سے کوئی جواب نہ ملنے پر وہ بالآخر خاموش ہو گئے۔ شاید وہ بھی جان چکے تھے کہ ہمیں ترک زبان نہیں آتی۔ آصف نے بتایا کہ ایک بار پہلے جب وہ اکیلے ترکی آئے تھے، زبان سمجھنے اور سمجھانے کے بارے میں ایسے ہی مشکلات پیش آئی تھیں۔ گاڑی کسی تنگ اور بل کھاتی گلیوں میں لا کر ترک ڈرائیور نے روک دی اور ایک صفحہ اور قلم نکال کر کچھ لکھنا شروع کیا۔ ان کی ٹوٹی پھوٹی باتوں اور ہاتھ کے اشاروں سے جو مطلب ہماری ناقص سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ ہمیں ان کو تقریباً 250 لیرا دینے ہیں یہ کافی زیادہ رقم بنتی تھی۔ ہم ان سے انگریزی میں بات کرتے اور وہ سر کو نفی میں ہلا کر 250 پر قلم سے گول دائرے بنانے لگتے۔ ہماری مشکل کا مشاہدہ کرتے ہوئے قریبی دکان سے کسی شخص نے ہماری ٹیکسی کا رخ کیا۔ گلی تنگ تھی اور ہماری ٹیکسی کی وجہ سے باقی گاڑیوں کو بھی گزرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ ایک قالین کا سوداگر تھا، جس کی دکان اسی گلی میں تھی۔ اس کو خوش قسمتی سے ترک زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی آتی تھی چنانچہ اس نے ہمارے درمیان ترجمان کا کردار ادا کیا اور بتایا کہ جب ٹیکسی اس طویل سرنگ سے گزر رہی تھی تو حکومت نے جدید خودکار نظام کے ذریعے ٹیکسی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کے ساتھ 100 لیرا بھی کاٹ لیے تھے جو کہ ٹیکسی ڈرائیور کو ادا کرنے ہوں گے۔ اس لیے جو 250 لیرا وہ مانگ رہا ہے وہ بالکل جائز ہے۔ آصف نے اس کو ادائیگی کی اور ہم گاڑی سے اتر کر راہ چلتے مسافروں اور دکان داروں کی رہنمائی حاصل کرتے ہوئے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔

Blue Mosque کے صحن میں انسانوں کا جم غفیر تصویر کشی میں مصروف تھا۔ چونکہ ابھی ابھی نمازِ جمعہ ادا کی گئی تھی تو بے تحاشا لوگ مسجد کے باہر اور اندر موجود تھے اور سیاحوں کے لیے راستہ کھلنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ ہم نے بھی مسجد کے باہر اپنی تصویر کھینچی اور اس قطار میں جا کھڑے ہوئے جہاں باقی سب سیاح اپنی باری کے منتظر تھے۔

مسجد سلطان احمد (Blue Mosque)

یہ تاریخی مسجد ۱۶۰۹ء تا ۱۶۱۶ء کے درمیانی عرصے میں سلطان احمد کے دور میں تعمیر کی گئی۔ اسی بنا پر اس کا نام ''مسجد سلطان احمد'' یا Sultan Ahmet Mosque ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی یادگار اس مسجد کو Blue Mosque کہتے ہیں۔

(جاری ہے)

☆.....☆.....☆

محشر خیال

ڈاکٹر میمونہ حمزہ۔ سعودی عرب

بتول کا آن لائن اجرا ہمارے لیے خوشگوار ہوا کا جھونکا ہے۔ ایک خواہش جو عرصے سے زبان پر آ رہی تھی، ان حالات میں روبہ عمل آ گئی۔ اس خدمت پر بتول کی مدیرہ اور انتظامیہ کے شکر گزار ہیں۔

اداریہ اس عالمی وبا اور تکلیف دہ صورتِ حال میں جھنجوڑنے والا اور رب کی طرف متوجہ ہو کر استغفار کی تلقین پر مبنی ہے۔ اللہ کی طاقت کے مقابلے میں سرکشی کرتے دنیا بھر کے طاغوت نے کس طرح اس وبا کے سامنے ڈگیں ڈال دی ہیں، لیکن اصل مرض اور درست جانب پیش قدمی بھی ضروری ہے۔

احمد حاطب صدیقی صاحب کی نظم ''پناہ مانگو'' موجودہ حالات میں اللہ کے سامنے گڑگڑانے کی مناجات ہے۔ حرم کی زمین پر سجدوں کی ممانعت، بندوں کے قصوروں ہی کے سبب ہے مگر.....

ہماری کوتاہیوں پہ بیت الحرم کی حرمت کو
مت نگوں کر!

ڈاکٹر عزیزہ انجم کی غزل حسبِ حال تھی۔ موت کا خوف کس کس طرح پھیل رہا ہے اور اس سے صرف اور صرف عافیت کی دعا ہی لبوں پر ہے۔

حبیب الرحمٰن صاحب کی غزل بھی خوب ہے۔ میرا جسم میری مرضی کے نعرے کی قلعی کھول دی، یہ شعر بہت عمدہ ہے:

باہر سا فرشتہ وہ کبھی بن نہ سکے گا
انسان کے اندر ہے جو حیوان میری جان

''قرنطینہ'' نیر کاشف کا خوبصورت افسانہ۔ گھروں میں رہنا تنہائی محسوس کرنے والے بزرگوں کے لیے کتنی بڑی خوشی ثابت ہوئی۔ اور اس کا اختتام انہیں کے لئے اصل ''قرنطینہ'' ہے۔

قانتہ رابعہ کا افسانہ ''پہلے نمبر پہ'' گھر کے کاموں میں جتی ہوئی عورت کے بارے میں ہے جو بھاگتے دوڑتے زندگی گزار رہی ہے۔ زندگی کا ہر کام بھاگتے دوڑتے انجام دینے والی ہے۔ ہر مشغولیت اس کو اپنے اندر گم کرتی ہے۔ زندگی کا اہم مصرف موبائل بھی بن چکا ہے، اور وہیں ایک پیغام سے اسے زندگی کا ہنر ہاتھ آ جاتا ہے کہ اگر اللہ کی بندگی ترجیح اول ہوگی تو باقی کام بھی عبادت بن جائے گی۔ بہت عمدہ پیغام!

عالیہ حمید کی سچی کہانی ''کبھی بھول نہ پائیں گے'' آج کے مادیت پرست دور میں امید کی کرن ہے۔ تربیت والدین کا پیارا سا رنگ صالح اولاد، جو امین ہیں اور صرف اللہ کی خاطر دوسروں کی مدد فرض جان کر کرتے ہیں۔

''سلسلے'' ہادیہ امین کا مختصر افسانہ ہے۔ پیغام عمدہ ہے۔ مل جل کر رہنے کا حسن بڑے فطری انداز میں بیان کیا ہے۔

حبیب الرحمٰن صاحب کی طویل کہانی ''نشیب و فراز'' بہت دلچسپ ہے۔ بھرپور تجسس، اور فلمی انجام!

ام ایمان کا ''واپسی'' دل میں کھب گیا۔ قبلہ اول کی حفاظت نسل در نسل سینوں میں کس طرح پروان چڑھتی ہے، بہت خوبصورت کہانی۔ ایک توجہ دلانا چاہتی ہوں۔ گنبدِ خضریٰ مسجدِ نبویؐ کے گنبد کو کہتے ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ والے گنبد کو گنبدِ صخریٰ کہا جاتا ہے۔ ایک اور ابہام ناموں میں تھا، چچا کا نام ہشام چچا اور کھوئے ہوئے بیٹے کا نام ہشام یوسف۔

اسوہ بتول کا ''حسنِ آوارگی'' مزیدار تھا۔ نٹ کھٹ شرارتیں اور لڑکپن کی بے ساختگی ہی اس کا حسن ہے۔

''روزہ اور انسانی صحت'' ڈاکٹر مقبول احمد شاہد کا مفید مضمون ہے، اس کی اضافی خوبی طبی نقطہ نظر ہے، اور سوالات کے جوابات بھی الجھنوں کو رفع کر رہے ہیں۔

''ہمیں کون سے حقوق چاہئیں'' ڈاکٹر فلزہ آفاق کی بہت اہم تحریر ہے جس میں انہوں نے معاشرے کی پسی ہوئی عورت کے اصل حقوق کی نشاندہی کی ہے، جن کے سلب کیے جانے پر عورت کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ انہیں اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ عورت ایک مفید شہری کے طور پر اپنی صلاحیتیں استعمال کرنے کے قابل بن جائے۔

نگہت پروین کی اپنے ابو کے ساتھ یادوں نے ہمیں بھی ماضی میں پہنچا دیا۔

☆.....☆.....☆

حبیب الرحمٰن۔ کراچی

آج 14 اپریل 2020 ہے لیکن ماہنامہ بتول کا شمارہ اب تک موصول نہیں ہوا ہے جس کی وجہ یقیناً ملک میں کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن رہی ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپریل کا شمارہ "بتول ڈاٹ کام ڈاٹ پی کے" پر شائع کر دیا گیا ہے۔ ہم پرانے لوگ الیکٹرونک میڈیا پر مطالعے کے اتنے عادی نہیں کہ ایک یا دو نشستوں میں رسالہ پورا پڑھ سکیں اس لیے بتول کے مارچ 2020 کو ہی تبصرے کیلئے منتخب کرنے کا ارادہ باندھ لیا ہے۔

بتول کو بتول کے لنک پر اب تک جس جس انداز میں بھی شائع کیا جاتا رہا ہے اس میں سب سے بہتر انداز موجودہ شمارے (اپریل) کو جاری کرنے کا ہے۔ اس سے قبل کبھی پورا رسالہ ایک ساتھ ڈاؤن لوڈ کرنا پڑتا تھا اور کبھی پورے پورے پیج۔ ہوتا یہ تھا کہ کبھی پی ڈی ایف پر کنورٹ کیا گیا پورا رسالہ اپنی شکل میں ڈاؤن لوڈ ہو جاتا تھا اور کبھی "یو آر ایل" کی شکل میں، جس کو دوبارہ پڑھنے کیلئے انٹرنیٹ کی موجودگی ضروری ہوا کرتی تھی۔ پورے پیج کے ڈاؤن لوڈ ہونے میں یہ پیچیدگی ہوتی تھی کہ کسی بھی مضمون کا آخری صفحہ عموماً یا تو کسی اشتہار، حاشیے یا کسی اور کے مضمون کے ساتھ جڑ جاتا تھا یا نوائے شوق کے ایک ہی صفحے پر ایک سے زیادہ شعرا لازماً شامل ہو جایا کرتے تھے لیکن اس مرتبہ غزلیں ہوں یا نظمیں، کسی کا کوئی افسانہ ہو یا مضمون، اس کا کسی اور کے ساتھ جڑا ہونا نہیں پایا گیا جس کی وجہ سے ہر لکھاری کو اپنے اپنے مضامین، غزلیں، نظمیں اور تحریریں محفوظ کرنے کیلئے کسی قسم کی ایڈیٹنگ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

بتول کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ ہونے والی تحریر میں کہیں بھی اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ تحریر بتول میں شائع ہوئی ہے یا کسی نے ان پیج میں خود لکھ کر اپنی ہی جانب سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ بتول کے فلاں ماہ اور فلاں سن میں شائع ہوئی تھی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یا تو اس کے بیک گراؤنڈ میں بتول کا "مونوگرام" یا کسی کونے پر بتول، مہینہ اور سال بھی درج کر دیا جائے تو کسی کو واٹس ایپ پر بھیجنے، ٹوئیٹر یا فیس بک پر پوسٹ کرنے پر اس بات کا پتہ چل سکے کہ شائع ہونے والی تحریر کس رسالے کی زینت بنی ہے۔ نیز اب تک پیج پیج میں جو جو ماہ و سال بتول کی ویب سائٹ پر پوسٹ ہونے سے رہ گئے ہیں ان کو بھی جلد مکمل کر لیا جائے تو بہت ہی اچھا ہوگا۔

ابتدا تیرے نام سے، ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ کا اداراتی موضوع خواتین کے سلگتے مسئلے پر گہری نظر کا غماز ہے۔ یہ ایک ایسا اشو ہے جس کو بے راہرویانہ طرز فکر و عمل نے کسی اور کے لیے مسئلہ بنایا ہو یا نہ بنایا ہو، خود خواتین کو بے یار و مددگار بنا کر ضرور رکھ دیا ہے، اور یہ تو بہت محتاط اور مہذب الفاظ ہیں، ورنہ دنیا نے تو خواتین کو ان کے حقوق کے نام پر معاشرے میں ٹشو پیپر بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان خواتین کا حجاب دنیا بھر میں عورتوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے دنیا بھر کی بے حجاب خواتین تو حجاب کی جانب پلٹ رہی ہیں لیکن ہمارے ملک میں حجاب کے خلاف ایک طوفان بدتمیزی اٹھ کھڑا ہوا ہے اور بات اس سے بھی آگے نکل کر "میرا جسم میری مرضی" تک جا پہنچی ہے۔

آج دنیا جس عذابِ الٰہی کا سامنا کر رہی ہے یہ سب ان ہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ آفتِ سماوی دنیا کو کس مقام پر لے جا کر چھوڑے۔ اللہ سے دعا کرنی چاہیے کہ "ڈرنا نہیں لڑنا ہے"

کہنے والوں کو اللہ عقل دے کیونکہ آفات سے لڑا نہیں ،اللہ کے غضب سے ڈرا جاتا ہے۔ اللہ سے اس عذاب کے ٹل جانے کی دعا کرنی چاہیے۔

انوارِ ربانی کے عنوان کے تحت لکھا گیا عبدالمتین صاحب کا مضمون "نکاح ،اہمیت،ضرورت اور مقصد" بڑا توجہ طلب ہے جس میں انھوں نے نکاح کی اہمیت،ضرورت اور مقصد پر بہت سنجیدگی کے ساتھ بات کو آگے بڑھایا ہے۔ایسے مضامین آج کل کے وقت کی اہم ضرورت ہیں تا کہ نوجوان کسی بگاڑ کی جانب جانے کی بجائے پاکیزگی اختیار کرنے کی جانب راغب ہوسکیں۔

ڈاکٹر میمونہ حمزہ کا مضمون "رسولؐ اللہ کی زندگی میں خواتین" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر لکھا گیا ایک بہت ہی معلوماتی اور تحقیقاتی مضمون ہے جس میں کچھ معلومات تو وہ ہیں جو سیرت کی کسی ایک کتاب میں یکجا نظر نہیں آتیں۔

تزئین حسن کا مضمون" کیا عورتوں کا کوئی معاشرتی کردار ہوسکتا ہے"ایک بہت اچھا تجزیہ ہے جس میں انھوں نے ہر دو انتہاؤں کی سوچ کا بہت باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب تو سرے سے اسلام سے ناواقفیت ہے ہی لیکن دوسری جانب اسلامی تعلیمات پر اپنی سوچ کو مقدم سمجھنا بھی شدید بگاڑ کی جانب چلے جانے کا سبب بنا ہے۔حاصل بحث یہی ہے کہ اعتدال کا راستہ ہی عورت اور مرد کے حقوق کا محافظ ہے اور اعتدال کا راستہ صرف اور صرف اسلام ہی ہے۔

نوائے شوق کے عنوان کے تحت نجمہ یاسمین یوسف کی غزل کا ہر شعر پُر مغز اور قابلِ داد ہے لیکن آخری شعر حاصل غزل ہے۔

ذرے میں آفتاب ہے قطرے میں آبِ جو
راہِ طلب میں دیدۂ بیدار چاہیے

شاہدہ سحر کی نظم "ملن کی آس" اور عالمی یوم خواتین کے حوالے سے لکھی گئی روبینہ فرید کی نظم "یہ میرا دن ہے"، بہت ہی عمدہ ہیں۔اللہ ان کے فن کو اور بھی فزوں تر کرے (آمین)۔

رمانہ عمر کی افسانہ کہانی بہت ہی عمدہ تھی۔کہانی اپنے آغاز سے اختتام تک اتنی دلچسپی لیے ہوئے تھی کہ اسے درمیان میں چھوڑنا کسی صورت ممکن ہی نہیں ہوا۔بنیادی نکتہ وہی بات ہے جس کو آج کل کی ہر خاتون اور خاص طور سے نوجوان بچیوں کو سمجھنا بہت ہی ضروری ہے۔

ڈاکٹر کوثر فردوس کا مضمون "ورکنگ وومن" بہت اصلاحی ہے۔ بے شک عورت کو گھر سے باہر نکل کر کام کاج کرنے کی پوری اجازت ہے لیکن بلاضرورت ایسا نہ کیا جائے تو بہت ہی اچھا ہے۔امید ہے اس میں جو حکمت ہے اسے ہر خاتون سمجھنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم ایک منفرد مضمون نگار ہیں۔اپنے مضامین میں وہ کسی طوالت کو اختیار کیے بغیر ہر بات کہہ گزرتی ہیں۔ان کا مضمون ''مفت میں پائیدار خوشی'' ایک ایسا معلوماتی مضمون ہے جس کو نہ پڑھنے والا کئی اہم معلومات سے محروم رہ گیا ہوگا اس لیے جس جس نے اسے اب تک نہیں پڑھا وہ اسے ضرور پڑھے اور اپنے علم میں خاطر خواہ اضافہ کرے۔

پروفیسر خواجہ مسعود بہت ہی اچھے انسان ہیں اور شاید ہی کسی کی تحریر کو نہ سراہتے ہوں۔خود تو ہیں ہی ایک اچھے لکھاری لیکن دوسروں کے لکھے کو پڑھنا اور پھر اسے سراہنا ان ہی کا خاصہ ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ میری کوئی غزل یا کوئی تحریر بتول کی زینت بنی ہو اور انھوں نے میری حوصلہ افزائی نہ کی ہو۔میں ان کی اس عنایت اور توجہ کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔اللہ تعالیٰ ان کی تحریروں میں مزید نکھار پیدا کرے اور جس انداز میں وہ لکھنے والوں کے حوصلوں کو بڑھاوا دیتے اور جلا بخشتے رہتے ہیں، اللہ انھیں اس کا صلہ دے (آمین)۔

میں اپنی غزل کے ایک شعر کی چیر پھاڑ پر بہت ہی دکھی ہوں۔ شعر کچھ یوں تھا کہ

پیار بیجا ہو تو نفرت نہیں پھوٹا کرتی
پھول بوئے ہوں تو کانٹے نکل آئیں کیسے

لفظ ''بیجا'' شاید ''بی جا'' یعنی بیجنا، بونا کے معنوں میں لینے کی بجائے ''بے جا'' یعنی خوامخواہ جیسے معنوں میں سمجھا گیا اور اس کو ''بے حد''

سے بدل کرلکھ دیا گیااور پہلامصرع کچھ یوں ہوگیا کہ

پیار بے حد ہو تو نفرت نہیں پھوٹا کرتی

اب دونوں مصرعوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں کہ شعر کا حسن ''بیجا'' (ب ی ج ا) میں زیادہ ہے یا ''بے حد'' میں۔

☆ بے حد معذرت۔ آپ کا دکھی ہونا بجا ہے۔ دراصل ''بیجا'' کی ب کے نیچے زیر ڈلی ہوتی جیسا کہ اب ہے تو یہ غلط فہمی نہ ہوتی۔ میں نے اسے آپ کی جانب سے پروف کی غلطی پر محمول کیا اور درستی کردی (ص۔ا)

☆.....☆.....☆

روبینہ اعجاز۔ کراچی

جتنے محدود اتنے محفوظ کے اس دور میں چمن بتول کا آن لائن رسالہ کسی نعمت سے کم نہیں لگا۔ مارچ اور اپریل کے دونوں شمارے ہمیشہ کی طرح اصلاحی وتفریحی لحاظ سے نمایاں ہیں۔ ابتدا تیرے نام سے میں صائمہ اسما کی قیمتی آرا کے ساتھ حالات حاضرہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اشعار کا چناؤ بہت خوب ہوتا ہے۔ اس دفعہ قانتہ رابعہ کی تحریر نے دل پر گہرا اثر کیا کہ سب دنیاداری میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ اصل مقصد حیات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ ان کی پچھلے ماہ کی تحریر ''بیمار کا حال .....'' بار بار پڑھی بھاری بھرکم ذمہ داریوں اور اپنی تکلیف کو ہلکے پھلکے انداز میں لکھنا ان ہی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ وعاجلہ عطا فرمائے۔ ام ایمان کا افسانہ دوبارہ پڑھ کر بھی ویسا ہی نیا لگا۔ بلاشبہ بہترین تحریر ہے۔ سلسلہ اور دوسری تحاریر بھی بہت خوب ہیں۔ مارچ کے شمارے میں فریحہ مبارک کی تحریر رخت سفر نے ماضی کے سفروں کی یادیں تازہ کردیں۔ سفرنامہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔ مارچ کے رسالے میں رمانہ عمر نے خواتین کی بیجا آزادی پر ''رہائی نہیں چاہیے'' میں خوبصورت انداز میں خواتین کو موثر پیغام دیا ہے۔ نگہت پروین کی تحریر ''ابو مجھے بہت یاد آتے ہیں'' اچھی تحریر ہے انہوں نے اپنے ابو کی تمام صفات کو بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ بشریٰ تسنیم کے گوشے نے ہمیشہ کی طرح سوچنے پر مجبور کردیا۔ فکری تربیت کے لحاظ سے اچھے مضامین ہوتے ہیں۔ بشریٰ تسنیم صاحبہ کے سفرناموں کا انتظار ہے۔

اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر آپ سب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ چمن یونہی ہرا بھرا مہکتا رکھے۔

☆.....☆.....☆

مریم وزیر۔ کراچی

خوش آمدید بتول!

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا

ہمارا بتول آن لائن ہوگیا

ماہنامہ بتول کا اجرا نومبر 1957 میں آپا حمیدہ بیگم نے کیا۔ یوں بتول رسالے کا 62 سال کی عمر میں آن لائن آنا واقعتاً ایک بڑا کام ہے۔ (تم جیو ہزاروں سال) مگر پھر بھی نہ جانے کیوں لگتا ہے کہ بڑی دیر کی مہرباں آن لائن آتے آتے.....

ہمیں عرصہ دراز (10 سال کہہ لیں) سے بتول کے آن لائن آنے، پڑھنے، پڑھانے کا شوق تھا۔ ویسے بتول 2012 سے آن لائن آرہا تھا۔ پھر 2017 میں سلسلہ منقطع ہوا۔ اب دوبارہ جاری ہوا ہے۔ کرونا نامی وبا اس کے لیے زحمت کے بجائے رحمت ثابت ہوئی اور یوں ہی لگا کہ اللہ نے شر میں سے خیر عطا کردیا۔ اگرچہ ویب سائٹ پر آنا پہلی بار نہیں ہے، مگر اب کے آمد بہتر تبدیلیوں کے ساتھ ہوئی ہے اور امید ہے مستقبل میں قائم ودائم رہے گی ان شاءاللہ۔

خیر تو جناب بے انتہا خوشی اور یقین وبے یقینی کی کیفیت میں لنک کو چھونے سے ویب سائٹ کھولی، جو فوراً کھل گئی۔ دل باغ باغ ہوگیا والا محاورہ حقیقتاً سمجھ میں آگیا۔ رنگوں کا اتنا پیارا، دھیما امتزاج کہ جیسے سخت دھوپ سے چھاؤں میں آجاتے ہیں بس اسی کیفیت کا احساس ہوا۔

Menu کی جگہ کو چھوا تو فہرست کھل گئی جس میں بہت کچھ ہے اور ان شاءاللہ آئندہ آنے والے دنوں میں بہت کچھ شامل ہوگا۔

سب سے پہلا آپشن home ہے، جو لوگ بتول رسالے کے

مقاصد، اور دیگر معلومات لینا چاہیں انہیں یہاں مل جائیں گی۔ ساتھ میں download کرنے کے حوالے سے معلومات ہیں، نیچے category میں انگریزی حروف تہجی کے تحت ہر مصنف کے نام کے آگے ان کی تحاریر بھی موجود ہیں۔

دوسرا آپشن magazines ہے اس میں سال 2011 سے 2015، اور 2016 سے 2020 تک کے جو بھی رسالے اپ لوڈ ہو چکے ہیں ان کو کھول کر پڑھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابھی کچھ کام باقی ہے، وہ بھی جلد پایہ تکمیل تک پہنچے گا۔

تیسرے آپشن download میں سال 2011 سے اب تک یعنی سال 2020 کے کسی بھی موجود رسالے کو ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں اور آف لائن پڑھنے کا مزہ ہی الگ ہے۔ چوتھے نمبر پر prices لکھا ہے جہاں ان کتابوں کی فہرست اور قیمت موجود ہوگی جو ادارہ بتول کے تحت شائع ہوئیں۔

پانچواں آپشن .news چھٹا Aboutus اور ساتواں Contact us ہے۔ جس صفحے کے نیچے جائیں گے دیگر چیزیں بھی ملیں گی (کیا سب بتا دیں؟) اب ان سب کے لیے ویب سائٹ دیکھنا ضروری ہے۔

بتول کا ویب سائٹ کی صورت میں آنا اس دور کا تقاضا تھا۔ ساتھ ہی اس بات کی ضرورت تھی کہ اس رسالے نے معاشرے میں اپنا جو اصلاحی و ادبی کردار نبھایا ہے اب ہر ایک کی پہنچ میں آئے۔ امید ہے ویب سائٹ میں وقت کے ساتھ مزید بہتری آئے گی. ایک دفعہ پھر تہہ دل سے مبارک باد قبول کیجیے۔

☆شکریہ مریم! ویب سائٹ کھل گئی ہے مگر ابھی کئی مسائل کا سامنا ہے۔ آپ سب کے صبر و تحمل اور دعاؤں کی ضرورت ہے

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

پہچان

اللہ رب العزت نے ہر شے کو پیدا کیا اور اس کو مخصوص شناخت، یا پہچان عطا کر دی۔ ہر چیز اپنی شناخت اور پہچان ہی کے دم سے قائم ہے۔ ہر شے کا وجود اسی وقت تک قابلِ ذکر ہے جب تک اس کی شناخت زندہ ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنا وجود، اپنی پہچان اور اپنے تشخص کا داعی ہے۔ آسمان کا وجود ان گنت اسرار و رموز سے وابستہ ہے۔ کچھ نظر آنے والے اور بہت کچھ نظر نہ آنے والے شہود ہی اس کی شناخت ہیں۔ دیکھنے والے کی نظر کے محدود یا لامحدود ہو جانے کے ساتھ ساتھ آسمان و کائنات کی شناخت بدلتی جاتی ہے۔ یہ نظر کے زاویے ہی ہیں جو دل کے سمندر میں اٹھنے والے طوفان کو افلاک سے جا ملاتے ہیں۔

آفتاب اپنی حرارت اور روشنی سے ممیّز ہے۔ ماہتاب، ٹھنڈی روشنی، نور، خوبصورتی کے اسرار سے موسوم ہے۔ ستارے اپنی معصومیت، جگمگاہٹ، راستہ کی نشان دہی کرنے کی شناخت پر نازاں ہیں۔ پھول، پھل، پودے، شجر، حجر، صحرا، موسم، دریا، پہاڑ، پانی، ہوا، سب اپنی شناخت رکھتے اور اس کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ کائناتِ رنگ و بو میں ہر شے اپنی حقیقت کو جانتی ہے اور اسی کے مطابق اپنی راہ پہ گامزن ہے۔ اسی لیے تو ''اس جہان آب و گل'' میں کوئی فتنہ نہیں..... دانہ گندم اپنی اصلیت سے واقف ہے وہ کبھی جو نہیں بننا چاہتا۔ گلاب کا پھول کبھی گوبھی کا پھول نہیں بننا چاہتا۔ سبزی کبھی اناج بننے پر اصرار نہیں کرتی اور اناج کبھی پھل بن جانے کی ضد نہیں کرتا۔ مٹی اپنی پہچان پہ راضی ہے۔ ہوا اپنی شناخت پر مطمئن ہے۔ شیر کبھی گھاس نہیں کھاتا، بکری کبھی خون خوار نہیں ہوتی۔ مچھلی کی شناخت پانی میں رہنا ہے وہ کبھی ریت پہ زندہ نہیں رہتی۔ پرندہ کبھی پانی میں گھونسلہ نہیں بناتا۔ زندہ رہنے اور اپنی راہ پہ قائم رہنے کی جو شناخت، جس کو عطا کر دی گئی وہ اس پہ خوش مطمئن ہے۔ وہ کوئی نیا تجربہ کر کے پہچان کا نیا رخ تلاش نہیں کرتا۔

انسان کا اپنا وجود بھی گواہ ہے کہ جس کی جو شناخت ہے وہ ہی اس کا اصلی مقام ہے۔ انسان کا ہر عضو اپنے اپنے مقام اپنی پہچان اور اپنے کام سے مطمئن ہے اور وہ ازلوں سے کر رہا ہے اور ابد تک اس کی یہی شناخت رہے گی۔ آنکھ کبھی بولنے پہ اصرار نہیں کرتی۔ زبان دیکھنے کا کام نہیں کر سکتی۔ کان کبھی بولنے کی کوشش نہیں کرتے۔ انسان کبھی دونوں ٹانگوں کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ انسان کبھی جانوروں کی طرح چلنا پھرنا پسند نہیں کرتا، بس ایک سوچ کا انتخاب ہی ہے جو انسان کو مضطرب رکھتا ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ سے مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ آسودگی کی تلاش میں ہے کہ وہ پہچانا جائے۔ کس قدر نادان ہے ناشکرا ہے کہ اپنی شناخت کا ادراک اپنی پہچان کا نور کھو بیٹھا ہے۔ انسان اپنے آپ کو جاننے کے باوجود نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے؟ وہ اپنے آپ کو کھوجنے کے چکّر میں ازلوں سے بیقرار ہے۔ ہر انسان کا ایک نام ہے جو اس کی شناخت ہے۔ یہ نام بھی کیا عجب لفظ ہے..... ایک نام کے بہت سے لوگ ہیں لیکن سب کی پہچان الگ ہے۔ کہنے کو سب انسان ہیں مگر ہر ایک کی پہچان الگ ہے۔ انسان اپنے ظرف، علم کے مطابق اپنی پہچان کرواتا ہے۔ تاریخ نے ہمیشہ اس بات کی گواہی دی..... قابیل نے اپنے حصے کا نام کمایا..... ہابیل بھی گم نام نہ رہا۔ نوحؑ بھی اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور ابن نوح بھی اپنے حصے کا کام کر کے رہا۔ موسیٰؑ و فرعون، ابراہیمؑ و نمرود، ابوبکرؓ و ابوجہل ایک ہی دور کے مختلف نام ہیں۔ ہر ایک کی پہچان اپنی اپنی ہے۔ اپنا تشخص ہے، کہنے کو سبھی انسان ہیں..... انسان کی ازلی کمزوری ہے کہ وہ دوسروں سے ممتاز نظر آئے، ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ دوسرے سب، ہر کوئی اس کو جانے، پہچانے، اس کے نام کا ڈنکا بجے، اس کے نام کا بول بالا ہو۔ ایک دنیا اس کے نام سے واقف ہو جائے۔ میں کیا انوکھا کارنامہ پیش کروں کہ دنیا میرے گن گائے؟ میں کیسا نظر آؤں کہ ہر نظر مجھے دیکھے۔ ہر زبان میرے

تذکرے کرے، ہر کان میری بات سنے۔انسان جانے یہ کیسے جذبے کا اسیر ہے کہ وہ لافانی ہونا چاہتا ہے اور عجب بات ہے کہ فانی چیزوں کا سہارا لے کر لافانی ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے اندر تلاش نہیں کرتا۔ وہ خود کو دوسروں کے دلوں میں تلاش کرتا ہے۔ اپنی روح میں نہیں جھانکتا دوسروں کی آنکھوں میں خود کو تلاش کرتا ہے۔ اپنا مقام خود متعین نہیں کیا۔ دوسروں کے رویے سے اپنے مقام کا جائزہ لیتا ہے۔ دوسروں کے دل ٹٹولنے میں مصروف ہے۔اپنے دل کا حال کبھی جاننے کی کوشش نہیں کرتا.....انسان کیوں دوسروں کے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا وجود اور اپنا مستقبل تلاش کرتا ہے۔اس کے مستقل کا حال مقدر کا تعویذ اُس کے اپنے گلے میں لٹکا ہوا ہے۔اپنے گلے میں لٹکی ہوئی تختی پہ کیا لکھا جا رہا ہے اس کی فکر نہیں دوسروں کے گریبان میں جھانکنا کتنا آسان لگتا ہے.....انسان وہ کر رہا ہے جو نہیں کرنا چاہیے اور جو عمل کیا جانا چاہیے اس سے غافل ہے۔ جو حاصل ہے اس سے لاپرواہے اور جو لاحاصل ہے اس کے لیے پریشان ہے۔ جو اس کی پہچان ہے اس سے منہ موڑے ہوئے ہے اور اس کا انتخاب کرتا ہے جو اس کی شناخت نہیں ہے۔

دراصل انسان نے اپنی پہچان کا غلط راستہ اختیار کیا۔ دنیا میں اپنی پہچان کے لیے دو ہی تو راستے ہیں۔حق اور باطل.....جس نے حق کا راستہ اختیار کیا سعادت وفلاح کے ساتھ اپنی شناخت کروائی۔ جس نے باطل کا انتخاب کیا اس نے اپنی پہچان شقاوت وخسران سے وابستہ کر لی۔حق کا ساتھ ہو یا باطل کا.....موت دونوں کا فیصلہ کرتی ہے۔ قابیل ہو، نمرود ہو یا فرعون یا نوح کا بیٹا ہامان ہو یا شداد ابوجہل ہو یا ابولہب سب نے موت کی وادی میں قدم رکھا اور دنیا کی تاریخ کے لیے نفرت کا عنوان بن گئے.....ادھر ابراہیم کا عشق ہو اسماعیل کی آداب فرزندی ہو یا حسین ابن علی کی جاں سپردگی۔ دنیا کے انسانوں کے لیے زندگی کی نوید بن گئے۔ یہی انسان کے حقیقی رخ کی پہچان ہے کہ وہ کیا انتخاب کرتا ہے اپنی پہچان کرانے کے لیے۔

چاند، تاروں، آسمان کی وسعتوں میں اپنا کھوج لگانے والے اور سمندروں کی گہرائیوں، زمین کی پہنائیوں میں ڈوب کر اپنی شناخت تلاش کرنے والے! ہزار سجدوں سے اپنی جبیں کو آلودہ کرنے والے انسان! اپنے من کی دنیا میں ڈوب کر اپنا آپ تلاش کر لے۔ یہ پہچان ہی حیات وممات کے نرالے معنی رکھتی ہے۔ زندگی کو امر کرنے کے لیے کوئی فانی سہارا نہیں لافانی سہارا چاہیے۔ اپنی شناخت اور پہچان کے لیے وہ لبادہ تلاش کر جو ابدی ہو.....وہ رنگ اختیار کرے جو سب سے حسین اور پکا پختہ رنگ ہو.....جو جس سے وابستہ ہے اتنی ہی اس کی پہچان ہے.....بادشاہوں کے وفادار غلام کا ذکر جب تک ہے جب تک بادشاہت قائم ہے۔خود کو اس ہستی کا غلام بنا لے جو رب کائنات ہے۔ جو وحدہٗ لاشریکَ لہٗ اور ہر شے سے بے نیاز، اسی کا رنگ اختیار کر۔اس کے رنگ سے بڑھ کر کون سا رنگ حسین ہو سکتا ہے۔

اپنے مقام، مرتبہ، پہچان، انا، عزت نفس، خودی کو جس ہستی سے وابستہ کیا وہی پہچان قرار پائے گی۔ امر ہونا ہے تو ''حی، قیوم'' سے ناطہ استوار کر لے۔ اس کا احساس اپنی روح میں زندہ رکھ۔ جس نے روح پھونکی ہے وہ ہمیشہ سے قائم ہے ہمیشہ قائم رہے گا۔اس کی تابانی کبھی گہنا نہیں سکتی۔اس کی پھونکی ہوئی روح تبھی چین پائے گی جب وہ اپنے منبع و سرچشمہ سے ملے گی۔اس ہستی باری تعالیٰ کی پھونکی ہوئی روح کا احساس جتنا روشن اور توانا ہوگا، اس سے تعلق بھی اتنا ہی مضبوط اور اعلیٰ شان کا ہو گا۔ رب کائنات سے تعلق، کی شناخت اور پہچان مل جائے تو وہ مقامِ خودی عطا ہوتا ہے جس کی بلندی پہ پہنچ کر انسان سے رب ذوالمنن خود اس سے رضا پوچھتا ہے اس کی رضا کا منتظر ہوتا ہے اور فرشتے اس بندے پہ رشک کرتے ہیں کہ روح کا روح سے ملاپ ہو گیا۔ بندے اور رب کے درمیان فاصلے ختم ہو گئے۔ پہچان کے مرحلے طے ہو گئے کیونکہ وہ قاری بھی ہے قرآن بھی۔ وہ آفاق میں گم نہیں، آفاق اس میں گم ہیں۔ وہ بھٹکی ہوئی روح نہیں اللہ کی امانت ہے۔ وہ محبّ بھی ہے محبوب بھی۔ جب محبّ اور محبوب کو ایک دوسرے کی پہچان ہو جائے تو پھر دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں۔اسی رضامندیِ باہم ہی کی طلب وتمنا تو مومن کی اصل ''پہچان'' ہے۔

جوئندہ، یابندہ۔☆